besturdubooks.wordpress.com
ایمان کیا ہے؟
تصنیف: فخر المحدثین شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ
ترجمہ: مولانا محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ
عمر پبلی کیشنز
www.besturdubooks.wordpress.com

ایمان کیا ہے؟

ایمان کیا ہے؟

اردو ترجمہ

تکمیل الایمان

تصنیف

فخر المحدثین شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ

المتوفی ۱۰۵۲ھ

☆☆☆☆☆☆☆

اردو ترجمہ

مولانا محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ (مدرس دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆☆☆

تسہیل و ترتیب: حافظ محمد سلیمان

☆☆☆☆☆☆

عمر پبلی کیشنز

فسٹ فلور یوسف مارکیٹ 38۔ اردو بازار، لاہور۔ فون:7356963

E-Mail: umarpublictions@hotmail.com

U/0076/12-03-S/R

نام کتاب	:	ایمان کیا ہے؟
تصنیف	:	فخر المحدثین شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ
اردو ترجمہ	:	مولانا محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ
تسہیل	:	حافظ محمد سلیمان
باہتمام	:	حافظ محمد احمد چوہدری
مطبع	:	چوہدری پرنٹنگ پریس
ناشر	:	عمر پبلی کیشنز۔ فسٹ فلور یوسف مارکیٹ
		38۔ اردو بازار، لاہور۔ فون:7356963
اشاعت	:	دسمبر 2003ء
قیمت	:	100:00 روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زیر نظر کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس کے نام سے ہی بآسانی ہوسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو عوام وخواص دونوں کیلئے مساوی ہے۔ اس لئے کہ ایمان مذہبی زندگی کی وہ اساس اور بنیاد ہے جس پر تمام عقائد اور اعمال کی زبردست عمارت کھڑی ہے کیونکہ عبادات وارکان اسی حقیقت کے مظاہر ہیں جس کا نام ایمان ہے۔ ایمان کی صحیح تعریف اور اس کی حقیقت سے ہمارا علم بے بہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل اور بنیاد ہی کمزور ہے جس پر دین ودیانت کی تعمیر ہوتی ہے جس چیز کی حقیقت پر ہی انسان پوری طرح مطلع نہ ہو اس کی فروع اور آثار کو چاہے پورا کر دیا جائے مگر نہ تو کماحقہٗ ان کی تکمیل ہوگی اور نہ اس عمل میں وہ جذبہ صحیح اور حلاوت حاصل ہوگی جو ایک اخلاص مندانہ عمل کا لازمی اثر ہوتی ہے۔

ایمان معرفت حق اور قلب کے جزم وایقان کا نام ہے جو اسی وقت میسر آسکتا ہے جب ان اسرار اور گہرائیوں کو سمجھ لیا جائے جو اس حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ جذبہ عمل کی کمی دراصل اسی سبب سے ہوتی ہے کہ آدمی اپنے عقیدہ کو اگرچہ حق جانتا ہو مگر اسے پوری طرح اس کے رموز اور حکمتوں سے واقفیت نہ ہو لیکن جو لوگ اس حقیقت کو پا گئے ان کی زندگی سر تا سر عشق ومحبت اور فدائیت کا نمونہ بن گئی۔ کیونکہ اس معرفت کے بعد ہی وہ عمل کی اس لذت سے آشنا ہوتے ہیں جو اس کے آثار ومظاہر کے طور پر مرتب ہوتا ہے۔

مسلمان سب کہلائیں گے وہ بھی جن کی مبارک اور مخلصانہ زندگیاں ساری امت

کیلئے ایک نمونہ اور اسوہ بن گئیں اور وہ بھی جو اپنے لئے بھی اور دین کیلئے بھی باعث ننگ وعار ہیں۔ اول الذکر حضرات ان ہستیوں پر مشتمل ہیں جنہوں نے معرفت حق کی جستجو کی اور اس کے بعد اسے پاکر خود بھی عشق خداوندی سے سرشار ہوئے اور دنیا کو بھی اس نورانیت سے جگمگایا۔ موخر الذکر وہ لوگ ہیں جو مذہب کو ایک موروثی چیز کی حیثیت سے اپنی قومیت کا عنوان بنالیتے ہیں۔ ایسے لوگ چونکہ دین وایمان کی حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں اس لئے وہ عموماً ارکان وعبادات کی صحیح تڑپ اور سچی لگن سے محروم ہوتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کو اگر سرسری طور پر دیکھنے کے بجائے حقیقت میں استفادہ کی غرض سے پڑھا جائے تو یہ ایک بہترین مربی ثابت ہوسکتی ہے جس کے ذریعہ دین وایمان کو زبردست تازگی حاصل ہوگی۔

محمد اسلم رمزی قاسمی
(فاضل دیوبند)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
کے
مختصر حالات زندگی

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے اجداد میں جس بزرگ نے سب سے پہلے سرزمین ہند پر قدم رکھا وہ آغا محمد ترک تھے۔ آغا محمد بخارا کے رہنے والے تھے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جب مغلوں نے وسط ایشیا میں آگ وخون کا ہنگامہ برپا کیا تو وہ اپنے وطن سے بددل اور مایوس ہوکر ترکوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ ہندوستان تشریف لے آئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے والد ماجد مولانا سیف الدینؒ ٩٢٠ھ بمطابق ١٥١٤ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم وعمل کی بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ، اچھے شاعر اور پر لطف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ لوگ ان کی ظرافت ولطافت، معاملہ فہمی اور محبت اسلوبی کے معترف تھے۔

ولادت: ماہ محرم ٩٥٨ھ مطابق ١٥٥١ء کو شیخ محدث دہلی میں پیدا ہوئے۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

یہ اسلام شاہ سوری کا عہد حکومت تھا۔ مہدوی تحریک اس وقت پورے عروج پر تھی اور علماء کی جانب سے تکفیر وتضلیل کا کام بڑے زور وشور کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ مہدوی فرقہ کے بانی سید محمد جونپوری تھے۔ ان کے متعلق مخالفین نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے اعتقادات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے ''خود سید محمد'' اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی

پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتداء میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاف کے غلو اور محدثات میں گم ہو گئی۔

محرم ۹۵۸ھ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک اہم مہینہ ہے۔ اسی مہینہ میں شیخ عبدالحق محدثؒ پیدا ہوئے اور اسی مہینہ میں ابوالفضل نے اسلامی شعار کی تضحیک و توہین میں وقت صرف کیا تو اول الذکر نے احیاء شریعت اور قیام امر بالمعروف میں اپنی ساری زندگی گزار دی۔ ایک سے ''دین الٰہی'' نے تقویت پائی۔ دوسرے سے ''دین محمدی'' کو عروج ہوا۔

باپ کے آغوش میں: شیخ محدثؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور خیالات کی نشوونما میں ان کے والد ماجد کا خاص حصہ تھا۔ ایام طفلی میں سے انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت کی طرف توجہ کی تھی۔ شیخ محدثؒ کا بیان ہے کہ:

''رات دن میں ان کی آغوشِ عاطفت میں تربیت حاصل کرتا تھا''

تین چار سال کا بچہ دیکھئے اور باپ کا یہ ذوق وشوق کہ شب وروز آغوش میں لئے اس کی تربیت میں مشغول ہے اور برسوں کی ریاضت نے جو ذہنی اور قلبی کیفیات اس میں پیدا کر دی ہیں ان کو منتقل کرنے کیلئے بے چین ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود کے اسرار سے اس بچہ کو آشنا کرنا چاہتا ہے۔ جب کوئی نکتہ بچے کی سمجھ میں نہیں آتا تو تجربہ کار باپ یہ کہہ کر تسلی کرتا ہے۔

''ان شاء اللہ رفتہ رفتہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اور جمال یقین نظر آئے گا''

لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کرتا ہے۔

''لیکن یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ اسی خیال میں رہو اور جس قدر ممکن ہو کوشش کرتے رہو''

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ بچے کی تربیت اس وقت سے ہونی چاہئے جب وہ شکاری کے جواب میں مسکرانا شروع کر دے۔ شیخ سیف الدین اسی اصول کے قائل تھے۔ ان کے تعلیمی نظریات بہت بلند تھے۔ تعلیم کا مقصد ان کے نزدیک صرف ذہن ہی

کی جلا نہ تھی بلکہ اس سے دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی بھی منظور تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ''حکمت زندگی'' سینا و فارابی کی کتابوں سے نہیں سیکھی جا سکتی۔ اس لئے چاہتے تھے کہ اپنے دل کی وہ بے چین دھڑکنیں جن میں زندگی کا راز مضمر تھا۔ اپنے بیٹے کے سینے میں منتقل کر دیں۔ اس زمانہ کی پوری کیفیت شیخ محدثؒ کی زبانی سنئے۔

''اسی زمانہ طفلی میں انہوں نے مجھے حضرات صوفیہ کے اقوال بتائے اور شفقت ظاہری کے ساتھ باطنی تربیت کا برابر خیال رکھا۔ میں بھی بہ تقاضائے فطرت ان اقوال کا دلدادہ تھا۔ جب وہ ذرا خاموش ہوتے میں کچھ دیر کیلئے اپنے آپ کو بھول جاتا اور واقفانِ اسرار کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کی استدعا کرتا۔ ان میں سے بعض باتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک حافظے میں محفوظ ہیں۔ یہ امر بہت غیر معمولی ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ چھٹنے کا زمانہ جبکہ عمر دو یا ڈھائی سال کی ہوگی ایسا یاد ہے جیسے کہ کل کی بات۔ اسی زمانہ میں جبکہ والد کی تربیت و عنایت کا فیض جاری تھا میں تحصیل علم کر چکا تھا اور ان کی خدمت میں علمی بحث و تکرار میں مصروف رہتا تھا۔ اسی شغل میں راتیں گزر جاتی تھیں۔ والد ماجد فقیر کو خصوصاً تلقین علم توحید اور علم اور تحقیق مسئلہ وحدت وجود میں شرف مکالمت عطا کرتے اور خوش ہوتے تھے۔

شیخ محدثؒ کے والد ماجد نے ان کو بعض ایسی ہدایتیں کی تھیں جن پر شیخ تمام عمر عمل پیرا رہے اور جو آج بھی ان کی خاص شان اور مخصوص روایات کا ایک اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ شیخ سیف الدین نے اپنے زمانہ کے علماء کی بے راہروی، کج بحثی اور گمراہی کا خوب مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی۔

''چاہئے کہ کسی سے علمی بحث میں جھگڑا نہ کرو اور تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اگر یہ سمجھو کہ دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھا دو۔ اگر نہ مانے تو کہو کہ مجھے تو یہی معلوم ہے۔ ممکن ہے کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا بھی ہو پھر جھگڑے کی کیا بات ہے''۔ فرمایا کرتے تھے کہ علمی بحث میں جو جنگ کی جاتی ہے وہ

صرف اپنے نفس کے واسطے ہوتی ہے۔ یہ لا حاصل چیز ہے اس سے منافرت اور مخالفت کے سوت ابل پڑتے ہیں۔ علمی مسائل میں محبت والفت سے تبادلہ خیالات ہونا چاہئے کہ "یہ محبت کا معاملہ ہے جس میں محبت نہیں وہ کیا کرے گا"۔

شیخ سیف الدینؒ کی ان نصیحتوں کو شیخ محدثؒ کے دماغ کے ہر رگ وریشے نے قبول کیا اور وہ ان کی زندگی کا جزو بن گئیں۔ اکبری دور میں بحث ومباحثہ، تکفیر و تضلیل کے کیسے کیسے ہنگامے برپا ہوئے، لیکن شیخ محدثؒ نے اپنے مسلک سے کبھی سر موانحراف نہیں کیا۔

شیخ سیف الدینؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے دل میں صرف حصولِ علم کی لگن ہی پیدا نہیں کی بلکہ اس کے ذہن میں علم کے متعلق صحیح نظریے بھی قائم کر دیئے۔

ابتدائی تعلیم: شیخ محدثؒ کو ابتدائی تعلیم خود ان کے والد ماجد ہی نے دی تھی۔ سب سے پہلے قرآن پاک شروع کرایا اور وہ بھی نئے انداز سے۔ شیخ محدث نے ابھی قواعد ہجی بھی نہیں سیکھے تھے کہ ان کے والد ماجد نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ قرآن پاک کی کچھ سورتیں لکھ کر ان کو یاد کرنے کیلئے دے دیتے تھے۔ اسی طرح وہ تین مہینے میں پورا کلامِ پاک ختم ہوگیا۔ خود شیخ محدثؒ فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے قرآن مجید بے سابقہ تعلیم قواعد ہجی کے (جس طرح لڑکوں کو عموماً پڑھایا جاتا ہے) دو تین جزو بلکہ اس سے کم تعلیم فرماتے تھے۔ وہ سبق لکھتے تھے میں پڑھتا تھا۔ قرآن کی یہی مقدار میں نے ان سے سبقاً پڑھی ہے۔ اس کے بعد ان کی تربیت و شفقت کے اثر سے ایسی قوت بہم پہنچی کہ ہر روز تھوڑا سا قرآن پڑھنے لگا اور جتنا پڑھتا تھا ان کو سنا دیتا تھا۔ غرض دو تین مہینے میں قرآن شریف ختم کر لیا"۔

اس کے بعد لکھنے کی طرف توجہ کی اور ایک ماہ کی قلیل مدت میں لکھنا سیکھ لیا۔

"تھوڑی ہی مدت میں اگر ایک مہینہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا کتابت اور انشاء کا سلیقہ پیدا ہو گیا"۔ اتنے کم عرصے میں پڑھنا اور لکھنا سیکھ لینا شیخ کے غیر معمولی ذہانت کا کرشمہ

ہے۔ شیخ محدثؒ نے اپنی اس کامیابی کا اصلی سبب اپنے والد کو قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ ان کی توجہ اور عنایت کا اثر ہے۔"

شیخ سیف الدینؒ نے اپنے فرزند کی تعلیم میں اس زمانہ کے مروجہ نصاب یا طریقہ، تعلیم کی پابندی نہیں کی بلکہ ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر جس کتاب کو مناسب سمجھا پڑھا دیا۔ اس زمانہ میں نظم کی بہت سی کتابیں نصاب میں شامل تھیں اور ان کا پڑھنا ابتدائی تعلیم کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ شیخ سیف الدین نے اپنے بیٹے کو بوستاں اور دیوانِ حافظ کے چند جزو کے علاوہ نظم کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی۔ قرآن پاک کے بعد میزان شروع کردی اور مصباح مادر کافیہ تک خود تعلیم دی۔ شیخ محدثؒ کا بیان ہے۔

"اور نظم کی ان کتابوں میں سے جو اس ملک میں مروج ہیں شاید گلستاں، بوستاں کے چند جزو اور دیوانِ حافظ پڑھایا ہو اور لڑکپن ہی سے قرآنِ پاک ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح و کافیہ تک خود تعلیم دی۔

پڑھاتے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "انشاء اللہ تعالیٰ تو جلد عالم بن جائے گا"۔

شیخ سیف الدینؒ اپنے بیٹے کی تعلیم خود اپنی نگرانی میں مکمل کرنے کیلئے بے چین رہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ اپنے جگر گوشہ کے سینہ میں وہ تمام علوم منتقل کر دیں جو انہوں نے عمر بھر کے ریاض کے بعد حاصل کئے تھے، لیکن یہ ان کی پیرانہ سالی کا زمانہ تھا اس لئے سخت مجبور بھی تھے۔ کبھی کتابوں کا شمار کرتے اور حسرت کے ساتھ کہتے کہ یہ اور پڑھا لوں، پھر فرماتے:

"مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جس وقت یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کمال تک پہنچا دے کہ جو میں نے خیال کیا ہے۔"

شیخ محدثؒ خود بے حد ذہین تھے۔ طلب علم کا سچا جذبہ تھا جس علم کی طرف توجہ کرتے پانی ہو جاتا۔ بوڑھا باپ بیٹے کی ذہانت اور سعی پیہم سے خوش ہوتا اور اس کے شاندار علمی مستقبل کے نقشے ذہن میں جماتا رہتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ شیخ محدثؒ خود اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''بارہ تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہوگی کہ مختصر ومطول سے فارغ ہو گئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں علوم عقلی ونقلی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کی سیر نہ کر چکے ہوں۔ اس زمانہ کی پوری روئیداد خود ان کی زبانی سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

اور یہ بھی فرماتے تھے (اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہیں) کہ ہر ایک علم میں سے مختصر پڑھ لو گے تو تم کو کافی ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد برکت اور سعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تمہیں سارے علوم بے تکلف حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد پاک نے یہ اثر کیا کہ تحصیل علوم میں مجھ کو ایسی سرعت حاصل ہوئی کہ جس کو طے زمان اور طے مکان کہتے ہیں۔ ہر علم حاصل ہو گیا یعنی مختصرات نحو مثل کافیہ ولب و ارشاد وغیرہ شاید ایک ایک جزو بلکہ زیادہ یاد کرتا تھا اور اتمام تحصیل علم کیلئے طبیعت اس قدر بے چینی تھی کہ اگر کوئی جزو ان مختصرات کا صحیح اور محشی مل جاتا تھا تو اس کو مطالعہ کر لیتا۔ حاجت استاد سے پڑھنے یا دریافت کرنے کی نہ ہوتی اگر بحث آسان ہوتی یا مضمون سے پہلے سے واقفیت ہوتی تو میرا فکر اس کو قبول نہ کرتا۔ خدا جانے کہ ان دنوں میں کیا سمجھتا تھا اور کیا دیکھتا تھا لیکن ہر کتاب کے متن اور حاشیے اور ان کے الفاظ سے پورا فائدہ حاصل کرتا تھا اور جو کتاب میرے ہاتھ آتی یا جزو کسی کتاب کا ملتا خواہ میرے پڑھے ہوتے یا نہ ہوتے اس کو اول سے آخر تک دیکھنا اپنے اوپر واجب کر لیتا تھا اور میں اس امر کا مقید نہ تھا کہ شروع یا خاتمہ، کتاب ملے تو دیکھوں، میری نظر تحصیل علم پر تھی، خواہ کسی طرح پر ہو''۔

اس زمانہ میں تحصیل علم سے ان کا مقصد کیا تھا۔ اخبار الاخیار میں انہوں نے طالب علمی کے زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے مقاصد اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ''ایک دن ان کے کچھ ساتھی اس بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ حصول علم سے ان کا کیا مقصد ہے؟ کسی نے کہا کہ معرفت الٰہی کی غرض سے علم حاصل کرتا ہوں۔ کسی نے کہا دنیوی مشکلات کو حل کرنے کیلئے۔ شیخ محدثؒ کی باری آئی تو انہوں نے جواب دیا:

''میں بالکل نہیں جانتا کہ تحصیل علم سے معرفت الٰہی حاصل ہو یا اسباب ہو، بالفعل

مجھے یہ شوق ہے کہ معلوم کروں کہ اتنے عقلاء اور علماء جو گزرے ہیں کیا کہتے ہیں اور کشف حقیقت معلومات میں کس قدر موتی پروئے ہیں اور اس کے حاصل کرنے کے بعد کیا حالت ہوئی یعنی حظ نفس کی طرف گئے یا محبت الٰہی یا تحصیل دنیا یا طلب عقبیٰ کی طرف''۔

(ماخوذ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر چیز کی ایک حقیقت ہے

عقائد و احکام کے سلسلہ میں یہ اہم حقیقت خاص طور پر ملحوظ رہنی چاہئے کہ نفس الامر (واقعہ) میں ہر چیز کی ایک حقیقت ہے اور اشیاء کی حقیقتیں انسانوں کے وہم وخیال پر موقوف نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پانی حقیقت میں پانی ہے اور آگ اپنی حقیقت کے ساتھ آگ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ہم پانی کو آگ تسلیم کرلیں تو وہ آگ ہی ہو جائے اور آگ کو اگر پانی کہہ دیا جائے تو وہ آگ کے بجائے پانی کی صورت میں منتقل ہو جائے۔ گرم کو اگر ٹھنڈا سمجھ لیا جائے تو وہ سمجھنے کے مطابق ٹھنڈا ہی ہو اور سرد کو گرم کہہ دیا جائے تو واقعہ میں بھی ایسا ہی ہو۔

اشیاء کی حقیقتوں کو اپنے وہم وخیال کے تابع سمجھنے والے صرف سوفسطائی[1] ہیں۔ حالانکہ ان کی اس اپج کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے اور نہ نقل سے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آگ اور پانی کی حقیقت اگر کچھ ہے تو وہ صرف ہمارے وہم وخیال کے تابع ہے؟ ہوش وحواس کی موجودگی میں اس قسم کا نظریہ وعقیدہ کوئی بھی نہیں رکھ سکتا۔

سوفسطائیہ کے علاوہ ایک دوسری جماعت (متکلمین کے یہاں جن کا نام مشککین ہے) وہ ہر چیز کے وجود وعدم میں شک کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ نہ معلوم یہ چیز ہے بھی

---

[1] (یوں تو تمام ہی فلسفہ کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ اشیاء کی حقائق کے سلسلہ میں جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں وہ اپنی جگہ پر صحیح ہے اور واقعہ کے مطابق ہے، اپنا خیال تو یہ ہے کہ بیشتر فلاسفہ نے اشیاء کی حقیقت کی تلاش میں حقیقت کو گم ہی کرنے کا غیر شعوری اقدام کیا ہے لیکن ان تمام مکاتیب فکر میں خاص سوفسطائیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ احمق فلاسفہ کی ایک جماعت تھی۔ نصیر الدین طوسی نے لکھا ہے کہ اب دنیا میں اس خیال وعقیدہ کا کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا بلکہ اب سوفسطائی اسے کہیں گے جو بے بنیاد دعویٰ پر غلط دلائل اور موہوم براہین سے کام لیتا ہو۔)

یا نہیں۔ اس جماعت کے شک کی انتہاء یہ ہے کہ یہ شک میں بھی شک کرتے ہیں۔ سو فسطائیہ کی طرح ان کا نظریہ بھی بہت غیر معقول اور بڑا غیر دانشمندانہ ہے۔ معقول گفتگو اور سنجیدہ مناظروں سے ان لوگوں کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ان کا مناسب علاج یہ ہے کہ ان کو آگ میں جلایا جائے۔ اگر یہ آگ کی سوزش وحرارت کا اعتراف کر لیں تو گویا انہوں نے اشیاء کے حقائق کے عقیدے کو قبول کر لیا اور اگر خاموش کھڑے جلتے رہیں تو بھی کوئی حرج نہیں اس لئے کہ ''خس کم جہاں پاک'' ہی کا کم از کم فائدہ حاصل ہوگا۔

عالم حادث ہے: خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات کے علاوہ جو کچھ بھی ہے حادث ہے۔ حادث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ پہلے کچھ بھی موجود نہیں تھا جو کچھ ہوا اور جتنی چیزیں وجود میں آئیں یہ سب پہلے معدوم تھیں۔ ''کان اللہ ولم یکن معہ شیئ'' یعنی خداوند ذوالجلال تھا اور اس کے ساتھ کوئی بھی چیز نہ تھی۔ آنحضور ﷺ کے اس ارشاد سے ہر چیز کے حادث ہونے کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔ عقلی طور پر آپ اسے یوں سمجھئے کہ دنیا میں سوائے تغیرات وحوادث کے کیا رکھا ہے اور یہی صبح وشام کی آمد ورفت اور روز وشب کا تغیر اس کے قدیم نہ ہونے کی علامت ہے کیونکہ قدیم ہمیشہ ایک ہی نہج پر رہتا ہے تغیرات اس تک راہ نہیں پاتے۔ بس غور وفکر اور مشاہدہ کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کی ایک ایسی ذات اور ان کی صفات نظر آتی ہیں جن میں تغیر وتبدل کے اثرات کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات وصفات کو قدیم سمجھتے ہوئے بقیہ ہر چیز کے حادث ہونے کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔

ہر چیز فانی ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک چیز موجود ہونے کے بعد فنا ہو جائے گی، خداوند کریم کا ارشاد ہے۔ ''کل شیئ ھالک الا وجھہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فنا ہوگی۔ اس آیت ربانی سے ہر چیز کی فنا اور اس کا معدوم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ بہشت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ جن کی حیات وبقا کی اطلاع دی گئی ہے فنا ان کو بھی ہونا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے ساتھ فنا کا یہ

معاملہ ایک لحظہ کیلئے ہو، اس کے بعد پھر وہ وجود کا جامہ پہن لیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے بہشت و دوزخ اور ملائکہ وغیرہ کے فنا ہونے کا عقیدہ رکھنا چاہئے اور اس کے بعد ان کے موجود رہنے کا اعتقاد بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف آیات واحادیث میں جو بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس کو اسی طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔

عالم کا بنانے والا ہے: ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا کا کوئی خالق ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور بنایا ہے اور یہ اس لئے کہ ہم پہلے دنیا کو حادث ثابت کر چکے ہیں۔ حادث کا مطلب یہی تو تھا کہ ایک چیز پہلے نہ تھی اور بعد میں ہو گئی۔ لہٰذا اسے وجود میں لانے کیلئے کوئی نہ کوئی ہونا چاہئے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ خود وجود میں آسکتی ہے تو اس کو ہمیشہ سے ہونا چاہئے اور جبکہ ہمیشہ سے نہیں ہے تو یقیناً کسی دوسرے نے موجود کیا ہوگا۔ انہیں عقلی دلائل کے پیش نظر اس عالم کیلئے صانع کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اور وہ قدیم ہے: اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صانع عالم قدیم ہو۔ اگر قدیم نہ ہوگا تو پھر حادث ہوگا اور حادث ہونے کی صورت میں وہ بھی اسی دنیا کا ایک فرد ثابت ہوگا اور عقل خود اس بات کی طرف راہ نمائی کرتی ہے کہ جو خود اسی دنیا کا ایک فرد ہوگا وہ اس عالم کا صانع وخالق کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لئے صانع عالم کو قدیم ہونا چاہئے۔

واجب الوجود ہے: صانع عالم واجب الوجود ہے یعنی اس کا وجود ذاتی ہے۔ کسی دوسرے کا عطا کردہ نہیں ہے۔ اگر صانع عالم کو واجب الوجود نہ مانا جائے تو پھر اپنے وجود میں وہ دوسرے کا محتاج ہوگا اور کیا یہ احتیاج وضرورت خدا کے شایانِ شان اور اس کیلئے زیبا ہے۔ دیکھئے (خدا) کا ترجمہ فارسی میں (خود آئندہ) ہے یعنی جو خود بخود موجود ہو اور اپنے موجود میں کسی کا محتاج نہ ہو، چنانچہ یہ لفظ خدا کی حقیقت کی ایک بلیغ تعبیر ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے تمام موجودات کا سلسلہ کسی ایک ذات پر ختم ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ذات جس پر یہ سلسلہ ختم ہو رہا ہے واجب الوجود ہو۔ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر موجودات کا سلسلہ دراز ہوگا جس کی انتہا کہیں نہ ہو سکے گی اور موجودات کے

سلسلہ کا اس طرح دراز ہونا عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے صانع عالم کا واجب الوجود ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ یکتا ہے: یعنی عالم کا بنانے والا ایک ہے۔ جیسا کہ "انما اللہ الٰہ واحد" (اللہ ایک ہے) سے ظاہر ہے اور چاہئے بھی یہی کہ اس عالم کو موجود کرنے والا اور پھر اس کا انتظام چلانے والا یکتا و یگانہ ہی ہو۔

زندہ ہے، جاننے والا ہے، قادر اور مختار ہے: وہ پروردگارِ عالم ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، جاننے والا ہے اور قادر ہے جو کچھ کرتا ہے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس عجیب وغریب دنیا کی تخلیق، صرف اسی سے ہو سکتی ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں۔ ایک جاہل، مضطر اور عاجز سے اس رنگا رنگ عالم کی ایجاد کیوں کر بن پڑے گی اور پھر اس کی مخلوقات میں جب یہ صفات کم و بیش پائی جاتی ہیں تو کیا خود اس میں یہ صفات موجود نہ ہوں گی۔

خشک ابرے کو بود ز آب تہی   نیاید از وی صفت آب دہی

یعنی وہی بادل برس سکتے ہیں جن میں پانی بھی موجود ہو اور ابر کے وہ ٹکڑے جن میں پانی موجود نہیں وہ کیا خاک برسیں گے۔ جس کی ذات ان صفات کا پیکر نہ ہو وہ دوسروں کو یہ صفات کہاں سے تقسیم کر سکتا ہے اور جبکہ مخلوقات میں یہ صفات موجود ہیں تو پھر یقیناً عالم کے بنانے والے میں بھی ہونی چاہئیں۔ اس لئے ہم صانع عالم کو سدا زندہ جاننے والا، قادر اور با ارادہ مانتے ہیں۔

بولنے والا، سننے والا اور دیکھنے والا ہے: یعنی وہ خدائے دو جہاں بولنے والا سننے والا اور دیکھنے والا ہے، گونگا، بہرا اور نابینا نہیں۔ یوں بھی وہ شخص جو اندھا، بہرا اور گونگا ہو ناقص سمجھا جاتا ہے اور عیب و نقص اللہ کیلئے مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اللہ کو بالکل بے عیب ہی ماننا ہوگا۔ ہاں یہاں یہ بات ضرور ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات بلکہ اس کی تمام ہی صفات کو عقل و قیاس سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس قدر

ضرور ہے کہ ان صفات کا ایک ہلکا سا نمونہ انسانوں میں پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ کی صفات کو تھوڑا بہت بس انہیں انسانی صفات سے سمجھ سکتے ہیں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی صفات اور انسانی صفات میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جس طرح اس کی ذات قدیم ہے ایسے ہی اس کی تمام صفات بھی قدیم ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کی ذات پاک حوادث کی آماجگاہ بھی نہیں بلکہ جتنی اس کی صفات اور اس کے کمالات ہیں سب ازل سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ حوادث کا محل تو حادث ہوتا ہے قدیم پر حوادث کے اثرات مرتب نہیں ہوتے اور اسی طرح پروردگار عالم نہ جسم ہے اور نہ جوہر ہے، جس طرح سیاہی اور سفیدی کا جسم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا اس طرح جسم نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی صورت و شکل ہے، ایسے ہی وہ مرکب بھی نہیں جس کی ترکیب وتالیف اجزا سے ہوتی ہے۔ وہ گنتی وشمار میں بھی نہیں آسکتا اور نہ اس کی کوئی حد وانتہاء ہے۔ اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے کسی بھی جہت میں محصور نہیں، نہ کسی مخصوص جگہ پر اس کا قیام اور نہ ہی کسی خاص زمانہ میں اس کا وجود، کیوں کہ یہ تمام صفات تو عالم میں ہوسکتی ہیں اور اللہ کی صفات عالم کی صفات سے بالکل جداگانہ اور علیحدہ ہوتی ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانہ میں نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ زمانہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور نہ اس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور نہ اس کا وجود زمانہ پر موقوف ہے۔ خدا اس وقت بھی تھا جبکہ زمانہ نہیں تھا اور اب کہ زمانہ ہے خدا بھی ہے۔ اس لئے وہ زمانہ میں گھرا ہوا نہیں اگرچہ وہ زمانے کے ساتھ ہی ہے۔

خداوند قدوس کی ذات اور اس کی صفات میں نہ اس کا کوئی مثل ہے اور نہ کوئی ضد و ند ہے۔ ضد اس کو کہتے ہیں جو کسی شے کی مخالف جنس سے ہو اور وہ مخالف جو جنس میں شریک ہے اس کو ند کہتے ہیں۔ اسی طرح نہ اس کا کوئی پشت پناہ اور نہ مددگار، بہرحال وہ بالکل ''احد'' اور ''صمد'' ہے۔

حلول واتحاد: اللہ تعالیٰ غیر کے ساتھ متحد بھی نہیں ہوسکتا اور نہ اپنے غیر میں سما

سکتا۔ کیونکہ دو مختلف چیزوں کا ایک ہو جانا محال ہے اور دوئی[1] وحدت کے منافی ہے اور غیر میں بالکل گھل مل جانا یہ اجسام کی صفات میں سے ہے۔ جیسے پانی، مٹی میں مل جاتا ہے آگ پتھر میں، روشنی گھر میں اور انسان مکان میں۔ پس جب یہ دوسری چیز میں سما جانا اجسام کے احوال وصفات میں سے ہے تو خداوند کریم کی صفت نہیں ہوسکتی۔ چونکہ وہ جسم ہی نہیں انہیں عقلی دلائل سے حلول واتحاد کا عقیدہ باطل ثابت ہوتا ہے۔

خدا کی ذات وصفات میں مختصر یہ کہ جو کچھ چیزیں کمالات میں سے ہیں اور باقی رہنے والی ہیں وہ خدا کیلئے ثابت ہیں اور جتنی صفات اپنی جگہ پر بری ہیں اور زوال پذیر، خدا کی ذات ان سب سے پاک ہے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے دو مختلف چیزیں باہمی طور پر ملنے کے بعد "ایک حقیقت" ہو جائیں یہ تو عقلاً ناممکن ہے اور اگر دونوں کو اپنی جگہ پر مستقل قرار دیا جائے تو اس سے دوئی لازم آئے گی۔ حالانکہ ہم خداوند قدوس کو واحد اور آحد مان چکے ہیں۔ لہٰذا یہ دونوں نظریے غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ اتحاد وحلول سے پاک ہے۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
(غالب)

خدااور اس کی رویت

یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ قیامت میں مومنین اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں گے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

''انکم سترون ربکم یوم القیامۃ کما ترون القمر لیلۃ البدر''

یعنی تم قیامت میں اپنے رب کو ضرور دیکھو گے جیسا کہ چودھویں رات میں چاند کو دیکھتے ہو۔

اس ارشاد گرامی میں آنحضور ﷺ نے رویت کو رویت سے تشبیہ دی ہے۔ مرئی کو مرئی سے مشابہ قرار نہیں دیا۔ نیز خدا کے دیدار میں قرب و بعد دور اور نزدیک ہونے کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس روز ایسی بصارت عطا فرمائی جائے گی کہ جو آج دل کی آنکھوں (بصیرت) سے دیکھتے تھے وہ قیامت میں چشم سر دیکھ پائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذات گرامی کو عقیدۃً بے کیف سمجھا گیا تھا اس روز اس کو بے کیف دیکھ لیا جائے گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ''عالم آخرت'' وہ جگہ ہے جہاں پر حقائق سامنے آجائیں گے، جو چیز آج تک پوشیدہ ہے آنے والی کل میں وہی سب کے سامنے ہوگی، اور جو آج غیب ہے کل کو وہی شہود ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رویت اور دیدار اس عالم کے منافی نہیں، اور پھر جبکہ آنحضور ﷺ نے اس کی اطلاع دی ہے تو رویت کیسے ہوگی؟ کیوں کر ہوگی؟ ان سب سے قطع نظر ہم کو چاہئے کہ رویت و دیدار کے وقوع پر ایمان و یقین رکھیں اور ان تشویش انگیز الجھنوں میں خود کو مبتلا نہ کریں۔ کیا ہوگا، کس طرح ہوگا؟ اس کی خبر سوائے

۔ مرئی وہ چیز جس کو دیکھنا ممکن ہو، اس حدیث میں مرئی شے قمر ہے۔ شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو قمر سے تشبیہ نہیں دی ہے بلکہ آپ نے دیکھنے کو دیکھنے سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح تم چاند کو دیکھتے ہو ایسے ہی اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھ لو گے۔

خداوند قدوس کے اور کسی کو نہیں۔

فرشتے اور اللہ کا دیدار: بعض کتابوں میں ہے اور کافی مشہور بھی ہے کہ دوسرے فرشتوں کو اللہ کی رویت کی سعادت حاصل نہ ہوگی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ اور حضرت جبریل بھی اس سعادت سے صرف ایک ہی بار شرف اندوز ہوں گے اور اسی طرح جنات بھی اللہ کے دیدار سے محروم رہیں گے۔ لیکن اس سلسلہ میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی تحقیق ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے اور اسی طرح امام اہلسنت والجماعت، شیخ ابوالحسن اشعریؒ نے بھی اپنی تصنیف میں صراحت سے لکھا ہے کہ ملائکہ کو بہشت میں دیدار ہوگا۔ بیہقیؒ بھی اس کے قائل ہیں بلکہ انہوں نے تو بعض احادیث بھی نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اللہ کی رویت ضرور ہوگی۔ متاخرین میں سے بعض علماء اہل سنت والجماعت نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور وہ سب فرشتوں کیلئے رویت باری کے قائل ہیں۔

ہاں جنات کے متعلق اگر کوئی شخص رویت کا قائل نہیں ہے تو اس کی کچھ گنجائش ہے۔ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ اور اور بعض دوسرے ائمہ نے کہا ہے کہ جنات کو ان کے اعمال پر نہ ثواب ہوگا اور نہ وہ بہشت میں داخل کئے جائیں گے۔ ان کے تمام اعمال کی جزاء بس یہی ہوگی کہ جہنم کی آگ سے اور عذاب سے وہ بچ جائیں۔ اس کے باوجود خدا کا فضل وکرم ہے اگر وہ چاہے تو اس سعادت سے جنات کو بھی بہرہ ور کرسکتا ہے۔ اگرچہ انسانوں کی طرح ہر روز یا ہر جمعہ کو ان کیلئے رویت نہ ہو۔

عورتیں بھی رویت باری سے محروم نہ رہیں گی: عورتوں کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کو دیدار ہوگا اور بعض انکار کرتے ہیں لیکن درست یہی ہے کہ عورتیں اس سعادت سے محروم نہ رہیں گی۔

امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ مومنین صالحین کو روزانہ اور عام مسلمانوں کو ہر جمعہ میں رویت ہوگی لیکن عورتوں کو روزانہ یا ہر جمعہ میں تو نہیں تاہم بعض خاص ایام میں جیسا کہ "عید" وغیرہ کے دنوں میں جن میں عام اجازت بلا روک ٹوک ہوتی ہے۔ عورتیں بھی

اس نعمت عظمیٰ سے دامنِ مراد بھر سکیں گی اور اپنا یہ خیال ہے کہ عورتیں، مومنین کے زمرہ میں شمار ہیں جیسا کہ فرشتے اور جنات بھی داخل ہیں۔ اس لئے عورتیں، فرشتے، جنات، مرد سب ہی اس بشارت وخوشخبری کے مخاطب ہیں اور اگر کسی دلیل سے ثابت کیا جائے کہ جنات وفرشتے داخل نہیں ہیں تو کوئی حرج نہ ہوگا بشرطیکہ دلیل قوی ہو لیکن عورتوں کو رویت باری سے محروم سمجھنا بڑی جراُت ہے۔ بھلا خود ہی سوچئے کہ فاطمۃ زہراؓ، خدیجۃ کبریٰ، عائشہ صدیقہؓ اور دوسری رسول اللہ ﷺ سے تعلق رکھنے والی بیبیاں نیز حضرت مریم، آسیہ جو تمام دنیا کی عورتوں کی سیدہ ہیں اور لاکھوں مردوں سے امتیاز وخصوصیت میں بمراحل آگے ہیں۔ آخر کس طرح دیدارِ خدا سے محروم رہیں گی یا عام مردوں سے اس نعمت جلیلہ کے حاصل کرنے میں پیچھے سمجھی جائیں گی بلکہ وہ احادیث جس میں مسلمان عورتوں کو "عید" کے روز دیدار کی اطلاع دی گئی ہے ان پاکباز اور نیک نام بیبیوں کو اس سے استثناء کیا جائے اور خاص طور پر ان کیلئے ہر روز رویت ثابت کی جائے تو مناسب ہوگا۔ سیوطیؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ کہنا کہ عورتیں وہاں خیموں میں پردہ نشین ہوں گی لہٰذا ان کو دیدار کیسے ہوسکتا ہے ایک ناقابلِ التفات بات ہے۔ عالم آخرت کو دنیا پر قیاس کرنا اور وہاں کے پردہ کے اہتمام کو دنیا کے انتظامات پر منطبق کرنا بجائے خود غلط ہے۔ ہاں بعض لوگوں نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یراہ المومنون" "وانکم سترون ربکم" میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور یہ دلیل ہے کہ رویت باری عورتوں کو نہ ہوگی۔ مگر ان کو بھی خدا کا دیدار قیامت میں ہوتا تو خاص طور پر مذکر کا صیغہ استعمال کرنا صحیح نہ ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً ایسے مواقع پر تغلیب[1] سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی صرف مردوں ہی کا ذکر کرنا اور کوئی ایسا صیغہ استعمال نہ کرنا جس سے عورتوں کا ذکر بھی صراحۃً ہوتا تغلیباً ہی ہے لہٰذا یہ دلیل عورتوں کو محروم سمجھنے کیلئے کارآمد نہ ہوگی۔

---

[1] تغلیب۔ عرب میں ایک چیز کو دوسری چیز پر غلبہ دے دیا جاتا ہے جیسا کہ قمرین کا آفتاب اور ماہتاب اطلاق ہے یا عمرین سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ مراد ہیں۔ اسی صنعت کو تغلیب کہا جاتا ہے۔

امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ رویت باری کے سلسلہ میں یہ تمام تفصیل، بہشت میں داخل ہونے کے بعد ہے ورنہ حشر میں کسی کی بھی تخصیص نہ ہوگی۔ تا آنکہ منافق و کافر بھی اللہ کو دیکھ سکیں گے۔ اگرچہ اللہ کا دیدار ان کیلئے قہر و جلال کے عالم میں ہوگا۔ اس کے بعد پھر ان کو کبھی اللہ کا دیدار نہ ہو سکے گا اور اس طرح ان کی حسرت و محرومی بڑھ جائے گی۔

خواب کی حالت میں: کیا خواب کی حالت میں اللہ کی رویت ہو سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ بحالت خواب اللہ کا دیکھنا نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے۔ خدا رسیدہ لوگوں نے اکثر و بیشتر اللہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا خواب مشہور ہے کہ انہوں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو دریافت کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہو اور جس کے نتیجہ میں آپ کا قرب و نزدیکی زیادہ سے زیادہ حاصل ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تلاوت قرآن ہی ایک ایسا عمل ہے جس سے دریافت کئے جانے والے مقاصد وابستہ ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت خواب میں خدا کا دیدار اور اس کی رویت ہو سکتی ہے۔

• ابن سیرینؒ جو تابعی ہیں اور تعبیر کے فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ جو شخص خداوند تعالیٰ کو خواب میں دیکھے، وہ جنتی ہے اور دنیا کے ہر غم و اندوہ سے نجات پائے گا۔ بہرحال خواب میں خدا کو ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔ از روئے عقل و نقل کچھ بعید نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ خواب ایک قلبی مشاہدہ ہے آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ظاہری آنکھوں سے دیکھے گا تو خدا کی مثال ہی کو دیکھ سکے گا۔ حالانکہ خدا کا مثل نہیں اگرچہ مثال ہے۔

مثل اور مثال میں بڑا لطیف فرق ہے۔ وہ یہ کہ مثل اس کو کہتے ہیں جو تمام صفات میں مساوی ہو اور مثال میں صفات کی مساوات و یک جہتی ضروری نہیں ہے۔ دیکھیے آفتاب، عقل کی تمام صفات میں اس کا مثل نہیں ہے۔ مگر پھر بھی عقل کی مثال آفتاب سے دی جاتی ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح محسوسات آفتاب کی روشنی سے

اجاگر ہوتے ہیں اسی طرح معقولات بھی عقل کی روشنی سے واضح ہوتے ہیں اور مثال میں اتنی مناسبت بھی کافی ہوتی ہے کہ عموماً بادشاہ کو آفتاب سے اور وزیر کو قمر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ علماء تعبیر نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص آفتاب کو خواب میں دیکھے تو اس کی ملاقات بادشاہ سے ہوگی اور اگر قمر خواب میں نظر آئے تو پھر وزیر سے ملاقات ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ'' حالانکہ اللہ تعالیٰ چراغ، چراغ داں، شیشہ درخت اور زیتون ہونے سے بالکل پاک ہے اور نہ یہ چیزیں اس کی مثل ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کو ''مضبوط رسی'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حالانکہ رسی قرآن کا مثل نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی مثال ہے اور چونکہ عالم خواب عالم مثال ہے اس لئے خواب میں اللہ کی مثال ہی دیکھے گا۔ آنحضور ﷺ کو بھی خواب میں دیکھنے کی یہی صورت ہے اس سلسلہ میں اگر مزید تحقیق مطلوب ہو تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض تصانیف کا مطالعہ مفید ہوگا۔

دنیا میں اللہ کی رویت: اس عالم میں اپنی اپنی آنکھوں سے حالت بیداری میں کیا اللہ کی رویت ممکن ہے۔ اس سلسلے میں دو رائے ہیں استاد ابو القاسم قشیریؒ کی رائے ہے کہ یہ جائز نہیں۔ قشیری کی یہ تحقیق جواز وامکان کے بارے میں ہے۔ ورنہ شب معراج میں آنحضور ﷺ کے علاوہ بقیہ سب کیلئے رویت خدا غیر واقع ہے۔ محدثین، فقہاء متکلمین اور مشائخ طریقت سب اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ اولیاء کو بھی اس دنیا میں اللہ کی رویت نہیں ہوسکتی ہے۔ تصوف کی مشہور کتاب ''تعرف'' میں لکھا ہے کہ مشائخ طریقت میں سے آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے بیداری کی حالت میں دیکھا ہے۔ ہاں چند جاہل صوفیاء جن کا کوئی اعتبار واعتماد نہیں ایسے لغو دعوے کرتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ مشائخ نے تو یہاں تک کہا کہ جو مدعی اس قسم کے باطل دعاوی کرتا ہو اس کی متفقہ طور پر تکذیب کرنا چاہئے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل نہیں کی اور اللہ کی حقیقت سے وہ بالکل ناواقف ہے۔

شیخ علاؤ الدین قونوی نے تعرف کی جو شرح لکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ اگر کسی مستند وثقہ شخص کے بارے میں صحیح سند کے ساتھ اس قسم کے دعویٰ کا ثبوت مل جائے تو تاویل کرنا چاہئے اور تفسیر کواشی میں ہے کہ اگر آنحضور ﷺ کے علاوہ کسی اور شخص کے بارے میں کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اس کو خدا کی اسی دنیا میں رویت ہوئی، تو ایسا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے۔

اردبیلیؒ نے اپنی تصنیف ''کتاب انوار'' میں جو فقہ شافعی کے سلسلہ کی ایک مفید تالیف ہے ثابت کیا ہے کہ جو اس طرح کا دعویٰ کرتا ہو کہ میں خدا کو اس دنیا میں ان مادی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور اس کے ساتھ گفتگو کرتا ہوں تو اس کے کافر ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں، یہی ''اردبیلی'' اپنے منظوم عقائد میں رقمطراز ہیں کہ:

''جو شخص اس دنیا میں ان آنکھوں سے خدا کے دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔ اس نے سرکشی کی حدود سے تجاوز کیا۔ شریعت مصطفویؐ سے وہ دور جا پڑا اور اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں اور آنے والے تمام رسولوں اور پیغمبروں کی اس نے کھلی مخالفت کی ہے یہی وہ زندیق ہے جس کی سزا بتاتے ہوئے خدائے قدوس کا ارشاد ہے کہ ''تم ان کے چہرے قیامت کے روز سیاہ پاؤ گے''۔

نسأل الله العافية ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم

حواشی

۱؎ ابوالفضل جلال الدین عبدالرحمٰن بن الکمال السیوطی رجب ۸۴۹ھ میں ولادت ہوئی۔ کثیر التصانیف مصنف اور وسیع النظر عالم ہیں، خودنوشتہ سوانح میں اجتہاد کا دعویٰ بھی کیا۔ علماء کی رائے ہے اگرچہ ان کی تالیفات میں صحیح اور غلط ہر قسم کے مضامین، موجود ہیں تاہم کسی موضوع پر کچھ لکھنے کیلئے سیوطی کی تصانیف سے استغناء بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ۶۱ سال دو مہینے اٹھارہ روز کی عمر پا کر ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔

۲؎ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری، حضرت ابوموسیٰ اشعری صاحب رسول اللہ ﷺ کی طرف انتساب کی وجہ سے اشعری کہلاتے ہیں۔ فن کلام کے امام ہیں۔ مسئلہ تکوین وغیرہ میں ابومنصور ماتریدی سے ان کا اختلاف ہے۔ اختلافی مسائل میں شوافع ان کی اتباع کرتے ہیں اور احناف ابومنصور ماتریدی کی، اشعری شروع میں معتزلی تھے لیکن پھر جامع مسجد بصرہ میں اپنے عقائد سے توبہ کی اور معتزلہ کے عقائد کی تردید اپنا

بہترین مشغلہ قرار دیا۔ ابوبکر صیدفی کہتے تھے کہ معتزلہ نے بڑا فتنہ برپا کیا تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے اشعری کو پیدا کیا اور انہوں نے معتزلہ کے عقائد کا مکمل رد کیا۔ ابن خرم نے لکھا ہے کہ ان کی ۵۵ تصانیف ہیں۔ ۲۷۰ھ یا ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ میں اچانک موت واقع ہوئی۔

۳ ابوبکر احمد بن البیہقی الفقیہ الشافعی حدیث وفقہ کے امام ہیں اور امت کے محققین میں ان کا شمار ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ امت میں سات آدمی کثیر التصانیف ہیں۔ ان میں سے ایک بیہقی بھی ہیں۔ ایک ہزار جز وان کی تصانیف کی تعداد بتائی جاتی ہے۔ محمد بن عبدالعزیز مروزی فقیہ نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک صندوق زمین سے آسمان کی جانب لے جایا جارہا ہے اور اس کے چاروں جانب آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا نور ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو فرشتوں نے جواب دیا بیہقی کی تصانیف ہیں جو بارگاہ کبریائی میں مقبول ہوئیں۔ دس جمادی الاولی ۴۵۸ھ شہر نیشاپور میں وفات پائی اور تابوت میں رکھ کر نعش بیہق منتقل کی گئی اور وہیں کی خاک میں علم وفضل کا یہ پیکر روپوش ہوگیا۔

۴ ابوحنیفہ النعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ، رئیس الائمہ، فقہاء مجتہدین کے متفقہ امام سنہ ۸۰ھ میں ولادت ہوئی، کوفہ آپ کی جائے پیدائش ہے۔ ابتداء میں علم کلام کا شوق تھا لیکن ایک عورت نے مسئلہ دریافت کیا اور امام اس کا جواب دینے سے قاصر رہے تو فقہ کی جانب توجہ کی۔ حماد بن ابی سلیمان کی درس گاہ میں فقہ کا علم حاصل کیا اور ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ امت میں سب سے پہلے فقہ کی ترتیب وتدوین کا کام انجام دیا۔ آپ کی ذکاوت وذہانت بے مثل تھی اور اسی طرح زہد وتقویٰ میں آپ کا کوئی نظیر نہیں ہے۔ آپ کے حالات مشہور ہیں۔ سنہ ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

۵ ابوعبداللہ احمد بن حنبل الشیبانی الامام کی ولادت ۱۶۴ھ اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ آپ کی پیدائش اور وفات دونوں بغداد میں واقع ہوئیں۔ فقہ کے ایک مستند مکتبہ فکر کے امام ہیں اور خلق قرآن کے فتنہ میں جرات مندانہ کارناموں کی وجہ سے آپ کی شخصیت ممتاز ومعروف ہے۔

۶ ولادت ۳۳ھ وفات سنہ ۱۱۰ھ حضرت انس بن مالک، حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر اکابر صحابہ کے فیض صحبت وتربیت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ تابعین میں وہ مدتوں سرتاج تابعین حضرت حسن بصریؒ کی صحبت میں رہے اور ان سب کے فیض صحبت نے ان کو پیکر علم وعمل بنا دیا تھا۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور تعبیر رویا وغیرہ علوم وفنون کے امام تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے عابد اور راس المتور تھے۔

۷ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری ماہ ربیع الاول ۳۷۶ھ میں پیدا ہوئے اور شہر نیشاپور میں ہفتہ کے دن صبح کے وقت ماہ ربیع الآخر ۴۶۵ھ میں وفات ہوئی۔ سلوک وتصوف میں ان کی تصنیف رسالہ قشیریہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر لطائف الارشادات بھی انہیں کے قلم کا کارنامہ ہے۔

۸ ان کا نام محمد بن محمد ابوالفضل ہے۔ اردبیل کے رہنے والے ہیں، اردبیل بالفتح اول وضم دال مہملہ وکسر بائے موحدہ بڑے زبردست فقیہ اور اصولی تھے۔ بغداد میں مدرسہ مالکیہ میں پروفیسر تھے لیکن سوئے اتفاق علم وفضل کا یہ ماہ منیرا اپنے گھر کے کنوئیں میں گر کر شہید ہوگیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ۶۲۵ھ میں یہ منحوس واقعہ پیش آیا۔

خالق کل

ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ زمین و آسمان، آسمان والے اور زمین والے، ان سب کی ذات اور ان سب کے افعال کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تمام امور و معاملات میں اس کی تدبیر کارفرما ہے اور تمام اشیاء کی تقدیر بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ تدبیر کا مطلب تو یہ ہے کہ تمام امور اس نے یقین کے ساتھ ایجاد کئے اور پھر ان سب کے انجام کار سے بھی واقف ہے اور تقدیر کے معنی یہ ہیں کہ تمام اشیاء کا ایک متعین اندازہ اور مخصوص تقدیر پر کام وہی چلاتا ہے اور ازل سے ہی خیر و شر، نفع و نقصان، خوبی اور برائی سب کچھ اسی کے قبضہ و قدرت کی چیزیں ہیں۔ تمام امور کا مکمل علم صرف اسی کو ہے اور کوئی بھی ذرہ نہ اس کے قبضہ سے باہر ہے اور نہ اس کے علم سے باہر۔ "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيم"

<u>اللہ بے نیاز ہے:</u> اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں اور نہ وہ کسی چیز کے کرنے پر مجبور و مضطر ہے۔ لطف و قہر، ثواب و عذاب، یہ سب خدا کیلئے لازم نہیں ہیں ؎

کردگار آں کند کہ خود خواہد
حکم بر کردگار نتواں کرد

فرمانبردار بندوں کو ان کے حسن اعمال پر جزاء و ثواب دینا محض اس کے فضل و کرم سے ہے اور سرکش و نافرمان انسانوں پر عذاب و عقاب یقیناً اس کا عدل و انصاف ہے۔ اگر وہ قہر و غضب سے کام لے جب بھی قابل تعریف ہے اور اگر فضل و کرم سے اپنے بندوں کو نوازے تو اس صورت میں بھی اس کی تعریف کی جائے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اس پر کسی کا حق ثابت نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مطیع لوگوں کو ثواب عطا فرمانے کی اور عاصی انسانوں پر عذاب کی اطلاع اس نے دی ہے۔ تو ہم کو عقیدہ و یقین رکھنا چاہئے

کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اس کے باوجود اگر وہ اس کے خلاف کرے یعنی تمام فرمانبرداروں کو عذاب وقہر میں مبتلا کردے اور سب عاصی و نافرمان اس کے فضل و کرم سے سرفراز ہوں تو اس پر بھی کسی کی مجال نہیں ہے کہ دریافت کرسکے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور ویسا کیوں نہ ہوا؟ [1]

بے نیازی کی ایک شان: اسی طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کسی اپنے ذاتی غرض و مقصد کے تحت نہیں ہوتے چونکہ صاحب غرض اپنی تکمیل خواہشات کے سلسلہ میں محتاج ہوتا ہے اور خدا کسی طرح بھی محتاج و ضرورت مند نہیں۔ اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ افعال سے اس کی اغراض بھی وابستہ نہیں لیکن اس کے باوجود ہر کام اور معاملہ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حکمت و مصلحت تک ہماری رسائی نہ ہو اور نہ ہم اس کو دریافت کرسکیں۔ نیز اس حکمت و مصلحت پر مرتب ہونے والے فوائد بھی صرف مخلوق ہی کیلئے ہیں ورنہ خدا کو تو ان کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مخلوقات ہوں یا نہ ہوں، ان کیلئے فائدے کی صورتیں ہوں یا نقصان کی شکلیں، خدا کیلئے سب یکساں ہے۔ وہ تو جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ سے کرتا ہے کسی ذاتی منفعت کے پیش نظر نہیں کرتا اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہم نے جو یہ کہا کہ خدا کے تمام افعال و اقدامات میں مصلحت و حکمت ہوتی ہے۔ سو اس مصلحت و حکمت کی رعایت کرنا بھی خدا کیلئے ہرگز ہرگز ضروری نہیں ہے۔ جل جلالہ و عظم سلطانہ۔

احکم الحاکمین: حکم بس اسی کا ہے اسی کے حکم سے کسی کام کا کرنا واجب ہوسکتا ہے اور

[1] خدا کے بارے میں یہ عقیدہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو اس درجہ با ارادہ و مختار نہ مانا جائے تو پھر وہ مجبور اور مضطر ٹھیرے گا۔ حالانکہ اضطرار عیب ہے جو خداوند تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ اسی لئے اہلسنت و الجماعت اور معتزلہ میں اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ بندے کے حق میں جو بہتر ہو خدا کیلئے ضروری ہے کہ وہ ضرور کرے۔ ورنہ بخل لازم آئے گا اور خدا کیلئے بخل مناسب نہیں ہے۔ معتزلہ کی یہ سوچ غلط اور بڑی غلطی ہے کیوں کہ "ہدایت" جس کے اچھے اور بہتر ہونے میں شبہ نہیں خداوند تعالیٰ نے سب کو عنایت نہیں فرمائی۔ جیسا کہ خود ارشاد ہے کہ "فلوشاء لہداکم اجمعین" اگر ہر اچھی اور بہتر چیز کا خدا کیلئے کرنا ضروری ہوتا تو پھر آج سب ہی ہدایت یافتہ ہوتے اور جبکہ ایسا نہیں تو معلوم ہوا کہ خدائے ذوالجلال پر کچھ بھی واجب نہیں اور اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے باوجود اگر کوئی معتزلہ جیسا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو مختار و با ارادہ نہیں سمجھتا۔

اسی کے منع کرنے سے افعال کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ کسی کا اچھا ہونا یا برا ہونا کسی فعل پر عذاب یا کسی ثواب سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔ فعل حسن وہ ہے جس کا خدا نے حکم دیا اور اسی طرح قبیح وہ ہوگا جس سے اس نے منع کیا۔ حسن وقبح کا تعلق شارع کے امر و نہی سے متعلق ہے۔ عقل کو اس سلسلہ میں کسی فیصلے کا اختیار نہیں ہے۔ نہ عقل کا یہ منصب کہ کسی اچھے کام کو وہ باعث ثواب کہے یا کسی بُرے کام پر عقاب وعذاب کا فیصلہ نافذ کرے، لہٰذا پہاڑوں کی گھاٹیوں میں رہنے والا جس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی اور مومنین کے ساتھ اٹھنے، بیٹھنے، ملنے جلنے کا بھی اس کو موقع نہ ملا اور پھر اسی عالم میں مرگیا۔ ایسا شخص آخرت میں مبتلائے عذاب ومحن نہ ہوگا۔ ہاں بعض علماء کہتے ہیں کہ ایمان وتوحید کے سلسلہ میں اس سے باز پرس ہوگی۔ یہ اس وجہ سے کہ عقل اتنا فیصلہ عالم کے تغیرات و انقلابات کو دیکھ کر ضرور کرسکتی ہے کہ اس عالم کا کوئی بنانے والا بھی ہے اور وہ ایک ہے، ساتھ ہی صفات کمالیہ سے متصف ہے۔ عالم کے پیدا کرنے والے کی معرفت شریعت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس میں عقل کو بھی دخل ہے۔

لیکن قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً" (یعنی ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے تاوقتیکہ اس تک کسی رسول کو نہ بھیجیں، جو ان کو اسلام کی دعوت دے اور وہ اس کی دعوت کو ٹھکرا دیں اور رسول کی خلاف ورزی کریں) صاف پہلی جماعت کی رائے کی تائید کرتا ہے جو عقل کے فیصلوں پر مواخذہ اور محاسبہ کو موقوف نہیں سمجھتے اور دوسرے علماء نے جو عقل کے فیصلوں کو خدا کے پہچاننے میں نافذ تسلیم کرتے ہیں اس آیت میں رسول سے عقل مراد لی ہے۔ ان کی یہ تاویل ہماری سمجھ سے قطعاً باہر ہے اور اس کو ایک واہی استدلال سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ محققین حنفیہ میں شیخ کمال الدین ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ:

۱۔ کمال الدین محمد بن عبدالواحد الشہیر بابن الہمام الحنفی ۷۹۰ھ میں ولادت ہوئی۔ سراج القاری الہدایہ سے علم فقہ حاصل کیا۔ تمام علوم میں تبحر کا درجہ حاصل تھا۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر کے نام سے لکھی۔ حنفیت کی جانب رجحان کامل تھا اور اس مذہب کی تائید ونصرت کیلئے زبان وقلم سے بے پناہ کام کیا ہے۔

مختار مذہب پہلی جماعت کا ہے اور ابوالبشر بزدوی کا بھی یہی رجحان ہے۔ نیز امام ابوحنیفہ سے بھی ایسی ہی روایت کی گئی ہے۔ بہر حال اس بحث کے نتیجہ میں یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ شارع جس کا حکم دے وہی اچھا اور نیک کام ہے اور جس سے روک دے برا اور قبیح اسی کو کہا جائے گا، افعال اپنی جگہ پر نہ اچھے ہیں اور نہ برے اور عقل ہرگز یہ فیصلہ نہیں کرسکتی ہے کہ یہ فعل حسن آخرت میں موجب ثواب ہے اور یہ برا کام عقاب کا سبب ہے ہاں افعال پر تعریف یا برائی، مثلاً:

انصاف کو اچھا سمجھنا، ظلم کو برا کہنا، علم کو ایک کمال سمجھنا اور جہالت کو نقص گردانا، بلاشبہ یہ فیصلے عقل ضرور کرسکتی ہے۔ بس اسی حد تک عقل کو حاکم سمجھنا چاہئے اور ان حدود سے باہر عقل کے فیصلوں پر اعتماد مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

نورانی اجسام

یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق فرشتوں کے نام سے موجود ہے، یہ فرشتے، لطیف اور نورانی اجسام ہیں اس لئے جس شکل میں آنا چاہیں آسکتے ہیں۔
حکماء کے نزدیک ان کی حقیقت ''ارواحِ[1] مجردہ'' ہے اور بدن ان کیلئے ایسا ہے جیسا کہ ہمارے لئے لباس ہے یعنی جس طرح لباس ہمارے جسم کے ساتھ ہے لیکن جسم کی حقیقت اور اجزاء ترکیبی میں داخل نہیں ہے۔ اسی طرح بدن بھی ان کے اجزاء ترکیبی میں سے نہ ہوگا اور پھر جس طرح ہم سینکڑوں طرز کے لباس بدل سکتے ہیں ایسے ہی فرشتے مختلف بدنوں کے تغیر پر قادر ہیں، اور ان میں مذکر و مونث کا بھی فرق نہیں نیز توالد و تناسل کا بھی سلسلہ ان کے ساتھ قائم نہیں ہے۔ فرشتے آسمان پر بھی ہیں اور زمین پر بھی بلکہ عالم کے تمام اجزاء پر فرشتے متعین ہیں جو اس کی تدبیر و تربیت اور حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔ خصوصاً انسانوں کے ساتھ تو ملائکہ کی ایک تعداد لگی ہوئی ہے جس میں بعض کا کام صرف انسانوں کے اعمال و افعال ہی کو لکھنا، لکھانا ہے اور بعض ان کی حفاظت کیلئے مخصوص ہیں، جو شیاطین جن وانس سے انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
عالم علوی و سفلی میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتے موجود نہ ہوں۔ فرشتے اس کثیر تعداد میں ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''خدا کی مخلوق دس حصوں پر پھیلی ہوئی ہے جس میں سے نو حصے فرشتے اور باقی ایک حصہ دوسری مخلوقات پر مشتمل ہے''۔
قرآن مجید کی بعض آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازو ہیں۔ چنانچہ ہم کو اعتقاد رکھنا چاہئے کہ ایسا ہی ہوگا۔ ان بازوؤں کی کیا حقیقت ہے یہ اللہ ہی بہتر

[1] حکماء ملائکہ کو ایک لطیف روح قرار دے کر اجسام کے ساتھ ان کا تعلق بہت معمولی قرار دیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک اجسام ملائکہ کے اجزائے ترکیبی میں نہیں ہے بلکہ اجسام کا تعلق ان کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانوں کے ساتھ لباس و پوشاک کا۔

جانتا ہے، زیادہ سے زیادہ آپ قوی ملکی سے تعبیر کر لیجئے۔ متشابہات میں یہی دوراہیں ہیں ان کے علاوہ کوئی تیسری راہ نہیں ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فرشتوں کے بازوؤں کی تعداد دو دو اور تین تین یا چار چار بتائی گئی ہے۔ اس سے صرف اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ بازو ہیں اور بہت سے ہیں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ ان کے بازوؤں کی تعداد اس سے زیادہ نہیں۔

اگر ان احادیث سے ان کے بازوؤں کی تعداد متعین کی گئی تو پھر آپ اس حدیث کا کیا جواب دیں گے کہ شب معراج میں جبریل علیہ السلام کو چھ سو بازوؤں کے ساتھ آنحضورﷺ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے صحیح یہی ہے کہ صرف ان کیلئے بازو کا عقیدہ رکھنا چاہئے۔ ہر فرشتہ کے کتنے بازو ہیں؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ان تمام فرشتوں میں چار فرشتے بڑے مقرب ہیں۔ اس دنیا کے اہم امور اور عالم ملکوت کے بڑے بڑے کام انہیں سے متعلق ہیں۔ ان چاروں میں سے ایک حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ علوم کا القاء اور عام انبیاء تک وحی کا لے جانا انہیں سے متعلق ہے۔ دوسرے ''میکائیل'' ہیں۔ مخلوقات کے رزق کی تعیین ہر ایک کا حصہ متعین کرنا، ان سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرے ''اسرافیل'' ہیں قیامت کے سلسلہ میں نفخ صور انہیں کا کام ہوگا۔ چوتھے ''عزرائیل'' مخلوقات کی روح قبض کرنا ان کے فرائض منصبی میں ہے۔ پھر اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ جبریل فرشتوں میں سب سے افضل ہیں اور عزرائیل و اسرافیل و میکائیل سے بھی افضل ہیں۔ کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ چاروں فضیلت میں برابر ہیں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے فرشتے بھی معظم و مقرب ہیں۔ چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ فرشتے ''عرشِ الٰہی'' کو اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے اجسام اس قدر عظیم ہیں کہ ان کے کان کی لو اور کاندھوں کے درمیان سات سو سال کی مسافت حائل ہے اور یہ بھی ہے کہ ان فرشتوں میں سے ہر ایک کا بارگاہِ خداوندی میں قرب و معرفت کے اعتبار سے مقام بھی طے شدہ ہے کہ اب اس مقام سے ترقی و تجاوز نہیں کر سکتے اور جو بھی

کمالات ان میں سے کسی کے مناسب حال تھے وہ اس کو بالفعل حاصل ہو چکے۔ مزید کمالات کے حاصل کرنے کا اشتیاق پھر اس کیلئے جدوجہد فرشتوں میں نہیں ہے چونکہ شوق واشتیاق کسی ایسے مطلوب کے سلسلہ میں ہوسکتا ہے جو حاصل نہ ہوا ہو، اور فرشتوں کو جو کمالات عطا ہونے تھے وہ عطا ہو چکے۔ لہٰذا اب ان میں جدوجہد، اشتیاق وشوق نہیں ہوگا؟ فرشتوں کے متعلق یہ وہ لوگ کہتے ہیں جو کہ فرشتوں میں عشق کا جذبہ ودیعت نہیں سمجھتے۔ ہاں اپنے خدا کی محبت اور مبداء کی معرفت کی صرف لگن ان کیلئے ثابت کرتے ہیں۔

یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے بلا تامل اس کو انجام دیتے ہیں اور ''ابلیس'' جس نے نافرمانی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ فرشتہ ہی نہیں تھا بلکہ جن تھا۔ عبادت وطاعت کے نتیجہ میں ملکی صفات حاصل کر کے ان میں شمار ہوتا تھا لیکن پھر اس نے اپنی فطرت کی جانب رجوع کیا اور خدا کی نافرمانی کی اور بعض کے نزدیک فرشتوں اور جنوں کی خلقت وحقیقت میں بڑی قریبی مناسبت بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آگ میں نور اور دھواں دونوں موجود ہیں۔ اگر دھواں نکل جائے تو پھر سوائے نور کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے اور جنات اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ جدا نہیں تو پھر ابلیس کو اگر فرشتوں میں شمار کیا جائے تو کیا حرج ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ اسرائیلی روایات کے وہ خرافاتی قصے جو ہمارے مفسرین کی سادگی کی بنا پر قرآن حکیم کی تفسیر کے اہم اجزاء بن گئے ہیں انہیں لغو اور بے سروپا داستانوں میں ہاروت وماروت کا بھی قصہ ہے جو روایت اس موقع پر گھڑلی گئی ہے اس کا یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت انسان کی نافرمانی اور تباہ حالی پر تعریض کرتے ہوئے بارگاہِ کبریائی میں عرض کیا کہ انسان کی جگہ اگر ہم ہوتے تو عدول حکمی اور سرکشی کا یہ مظاہرہ کیوں ہوتا۔ اسی پر یہ دو فرشتے ہاروت وماروت زمین پر بھیجے گئے۔ انسانی شکل وصورت کے ساتھ، صفات بھی انسانی ان کو دی گئیں۔

زہرہ نامی ایک عورت کو دیکھا کسی جھگڑے میں حکم ٹھہرے تو اس ساحرہ کے حسن و جاذبیت سے متاثر ہو کر بے راہروی کی ایک طویل و تاریک داستاں پیچھے چھوڑ گئے۔ خود بابل کے کنوئیں میں عذاب و محن میں مبتلا ہیں اور دل فریب زہرہ آسمان کی عروجی فضا میں کوکب درخشاں بن گئی۔ اسرائیلات کے ان بے بنیاد قصص سے فرشتوں کی عظمت اوران کی پاک بازی پر کتنا بڑا الزام آتا ہے۔ کاش کہ عام مفسرین اس کو محسوس کرتے تاہم دیدہ ور علماء کی نظر سے یہ روایت کس طرح بچ کر نکل جاتی۔ انہوں نے اس کے ایک ایک گوشے پر تحقیق کی نظر ڈالی۔ اور پھر فیصلہ کیا کہ یہ از سرتا پا بے بنیاد، لغو اور گھڑی ہوئی داستانوں کا ایک خرافاتی حصہ ہے۔ قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ مفسرین نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا کسی صحیح حدیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ابو حیان اندلسی نے اس واقعہ کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی طرح رازی نے بھی روایت کے تمام اجزاء نا قابل اعتبار قرار دیے ہیں۔ شہاب عراقی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

ونص الشهاب العراقي على ان من اعتقد في هاروت و ماروت انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهر فهو كافر بالله‌تعالى العظيم فان الملئكة معصومون

(روح المعانی ص ۳۴۱ ج)

"جو شخص ہاروت و ماروت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے اور زہرہ کے ساتھ بدکاری کی بنا پر اب بابل کے کنوئیں میں مبتلائے عذاب ہیں ایسا عقیدہ رکھنے والا بلاشبہ کافر ہے کیوں کہ ملائکہ کا معصوم ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے اور اس طرح کے عقائد قرآنی نص سے بالکل خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون. لا يستكبرون عن عبادته ولا يستحسرون. يسبحون اليل والنهار لا يفترون.

مذکورہ بالا تصریحات کے بعد قارئین ہاروت و ماروت کے واقعات کے پیش نظر مولف کی ان تصریحات پر پریشان نہ ہوں گے جو انہوں نے ملائکہ کی عصمت کے سلسلے میں پیش کیے ہیں۔

آسمانی کتابیں

وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ نے بعض پیغمبروں پر کتابیں نازل فرمائیں ہیں اور دوسرے انبیاء کو ان کی اتباع کا حکم دیا۔ اگرچہ آسمانی کتابوں کی تعداد ایک سو چار ہے لیکن ان سب میں چار کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک تورات ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور پھر بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو اسی پر چلنے کا حکم دیا گیا۔ زبور ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ان آسمانی کتابوں میں ذکر الٰہی اور احکام کے بعد کتاب کا ایک بڑا حصہ آنحضورﷺ آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کی امت کے احوال وصفات کے مضامین پر پھیلا ہوا ہے۔ انبیاء کی مجالس آنحضورﷺ ہی کی صفات وتعریف پر ختم ہوتیں جن کے ذریعے اور توسل سے وہ بارگاہِ ایزدی میں تقرب حاصل کرتے۔

اور پھر سب سے آخر میں ''قرآنِ کریم'' ہے جو تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ اور ان کا جوہر ہے۔ آنحضورﷺ پر نازل کیا گیا، فصاحت و بلاغت قرآنی اعجاز ہے جو دوسری آسمانی کتابوں میں موجود نہیں ہے، اگرچہ توریت اس قدر ضخیم اور پھیلی ہوئی کتاب تھی کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے اس کو یاد بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود اعجاز واختصار کے اعتبار سے قرآن تمام آسمانی کتابوں میں سب سے مکمل اور اعلیٰ واقع ہوا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں خدا کا کلام ہونے کی وجہ سے باعظمت ہیں اور ان میں ایک کو دوسرے پر کوئی ترجیح نہیں لیکن اس کے باوجود بعض کچھ مخصوص اسباب کی بناء پر افضل ہی شمار کی جائیں گی، جیسا کہ ایک طرف انبیاء کے متعلق کہا گیا ''لا نفرق بین احد من رسلہ'' یعنی ہم پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ تلک الرسل

فضلنا بعضهم علىٰ بعض" جس سے انبیاء میں ایک پر دوسرے کی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے۔ سو اسی طرح آسمانی کتابیں بھی کتاب کی حیثیت میں سب شریک ہیں اور ہماری طرف سے کوئی تفریق نہیں، یعنی یہ کہ کسی کو ہم مانیں اور کسی کا انکار کر دیں، ایسا ہرگز نہیں لیکن پھر قرآن کو بقیہ تمام کتابوں میں افضل مانتے ہیں، جیسا کہ انبیاء میں نبی و رسول ہونے کی حیثیت سے سب کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن افضل جناب رسول اللہ ﷺ ہی کو مانتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

اسماءِ حسنیٰ[1]

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جناب باری عزاسمہ اپنی ذات وصفات میں تمام ممکنات سے قطعاً جدا وممتاز ہیں، اس لئے اپنی عقل وقیاس سے اس کا کوئی نام تجویز کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ شریعت سے جتنی اس کی صفات اور نام ثابت ہیں بس انہیں پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اسمائے توقیفی کا مطلب یہی ہے کہ شارع سے صرف اتنے ہی نام منقول ہیں اور ہمارے سننے میں یہی آئے ہیں۔ لہٰذا سوائے ان ناموں کے جو شرع سے نقل ہو کر پہنچے کسی دوسرے نام سے موسوم کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اگرچہ عقل کا فیصلہ یہی ہو کہ یہ نام خدا کیلئے موزوں ومناسب ہے۔ تاہم عقل کے یہ فیصلے ناقابل اعتبار ہیں (اور ایک بات خاص طور پر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے) کہ اگر آپ کے اختراعی نام، توقیفی اسماء سے ہزار معنوی مناسبت رکھتے ہوں لیکن پھر بھی ان ایجاد کردہ اسماء کا اطلاق خدا پر جائز نہیں ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ خدا کو شافی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ توقیفی اسماء میں سے ہے لیکن طبیب نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ طبیب شرع سے ثابت نہیں ہے۔ حالانکہ شافی اور طبیب میں معنوی اتحاد موجود ہے۔ ایسے ہی جواد کہہ سکتے ہیں لیکن سخی نہیں کہا جا سکتا، عالم کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر عاقل کے اطلاق کی گنجائش نہیں۔

ہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ خدا کے نام تجویز کرنے کی ممانعت ان اسماء میں ہے جو کسی صفت پر دلالت کرتے ہوں، اسماء ذات مستثنیٰ ہیں چونکہ ''نام رکھنا'' ایک تصرف ہے جس کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہے مگر پھر بھی ان اسماء کے اختیار کرنے میں ضرور احتیاط ہونی چاہئے۔ جو کفار کے یہاں خدا کیلئے استعمال ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں کفر کا خطرہ[1] ہے۔

---

[1] دوسری قوموں میں جو خدا کیلئے نام مستعمل ہیں مثلاً یہود کے یہاں یہوداہ۔ فارسی میں ایزد، ہندی میں بھگوان پرمیشر وغیرہ ہو سکتا ہے کہ ان اقوام نے خدا کے یہ نام کسی ناجائز صفت کے لحاظ سے رکھے ہوں جس کا ان زبانوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر ہم کو علم نہ ہو۔ اس لئے احتیاطاً خدا کیلئے یہ نام استعمال نہ کئے جائیں لیکن اس کے ساتھ ان کی بے تعظیمی بھی ہرگز نہ کی جائے۔

ایک بات اور سنئے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام مشہور ہیں، مگر نام، اس عدد سے بہت زیادہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے بتانا ضروری نہیں سمجھا اور دوسرے نام جن کی حقیقت تک عام انسانوں کی عقل نہیں پہنچ سکتی، زبان شرع پر استعمال ہوئے ہیں لیکن مشہور صرف یہی ۹۹ اسماء ہوئے، ان اسماء کی شہرت اصل میں ان خاصیتوں کی وجہ سے ہے جو ان اسماء میں موجود ہیں۔ ایک حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''خدا کے ۹۹ نام ہیں جو ان کو محفوظ کر لے وہ جنتی ہوگا'' اس خیال کی تائید ہوتی ہے، آپ اسے یوں سمجھئے کہ کوئی بادشاہ اعلان کرتا ہے کہ ''میرے پاس ایک ہزار سوار ہیں جو کوئی ان سے مدد طلب کرتا ہے وہ اس کی امداد کرتے ہیں اور یہ سوار جس طرف رخ کرتے ہیں تو فتح و کامیابی ان کے قدم چومتی ہے''۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس بادشاہ کے پاس ان ایک ہزار سواروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟ بلاشبہ یہ مراد متعین کرنا غلط ہے، بلکہ اس اعلان شاہی سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگرچہ اس کے پاس ہزارہا سوار ہیں لیکن یہ ایک ہزار سوار ان صفات کے حامل ہیں۔

بس اسی طرح ان ۹۹، اسماء کے علاوہ خدا کے اور نام بھی ضرور ہوں گے مگر ان ۹۹ ناموں کی شہرت بہشت میں داخل کرانے کی وجہ سے ہوئی جس کا حدیث میں اظہار کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہم ان اسماء اور بہشت کے باہمی تعلق کو نہ جانتے ہوں۔

افعال کا پیدا کرنے والا: اس سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ تمام اشیاء کا خالق اور پیدا کرنے والا خداوند کریم ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسانوں کے افعال واعمال پر بھی شے کا اطلاق ہوسکتا ہے، اس لئے انسانوں کے افعال بھی خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے سمجھے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے تمام افعال واعمال خدا کے اسی طرح پیدا کئے ہوئے ہیں جس طرح خود انسان خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ارشاد ہے کہ ''واللہ خلقکم وماتعملون'' اسی خدا نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال و افعال کو بھی۔ معلوم ہوا کہ کفر وایمان، طاعت وعصیاں نیکی اور بدی، سب خدا کے علم اس کے ارادے اور تقدیر سے، صادر ہورہے ہیں لیکن اس کے باوجود خداوند قدوس ایمان و

طاعت سے خوش ہوتا ہے اور کفر و نافرمانی اس کو قطعاً پسند نہیں۔

دیکھئے یہاں ایک باریک فرق ہے جس کو آپ سمجھئے، پیدا کرنا اور چیز ہے اور راضی وخوش ہونا ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا ان امور سے ہوتی ہے جن کے کرنے کا وہ حکم دے اور کبھی ایسا بھی[1] ہوتا ہے کہ کسی بات کا حکم دیتا ہے حالانکہ اس کا کرانا مقصود نہیں ہوتا، حکم دینا اور پھر یہ چاہنا کہ یہ کام نہ ہو اس کی مثال اس طرح سمجھئے جیسے کوئی آقا ہے اور وہ اپنے غلام کی نافرمانی دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے، تو وہ اس کو کوئی حکم دے کہ یہ کام کر، حالانکہ وہ کام آقا کا پسندیدہ نہیں ہے، اگر ملازم وہ کام کر گزرا تو اس کی سرکشی و نافرمانی سے سب واقف ہو جائیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی حکم کرتا ہے حالانکہ بعض اوقات وہ کام کرانا مطلوب نہیں ہوتا، حکمت یہ ہوتی ہے کہ بندوں کی حقیقت معلوم ہو کہ کون عاصی ہے اور کون مطیع و فرمانبردار، نیز اپنے علم ازلی کا اظہار بھی مقصود ہوتا ہے۔

---

[1] مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کر لے۔ ہماری طرف سے کوئی جبر و اکراہ نہیں، اس ارشاد میں کفر کی نسبت جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امر کے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کفر سے قطعاً راضی نہیں ہے۔ چنانچہ کفر اختیار کرنے والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کفر بھی خدا کا پسندیدہ فعل ہے اور دلیل یہ ہے کہ اس نے کفر کا حکم دیا ہے۔ اگر کفر اس کو ناپسند ہوتا تو حکم کیوں دیتا؟ جواب اس کا وہی ہے کہ حکم دیتا ہے حالانکہ کرانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ کچھ دوسری حکمتیں اور مصالح ہوتے ہیں جن کیلئے یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آقا اور غلام کی مثال سے اسی حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح آقا اگر اپنے ملازم پر کسی وقت گرفت کرے تو دیکھنے والے اس کو ظالم و شقی نہ کہیں گے۔ چونکہ غلام کی نافرمانی وہ خود دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اخلاقاً، قانوناً ہر شخص اب آقا کو اس کی اجازت دے گا کہ وہ اپنے غلام کو اس کے کیفر کردار تک پہنچائے، اسی طرح خدا کی بطش خوفناک شکل میں جب نافرمان بندوں پر اپنا کام کرے گی تو ہر منصف اور سلیم الطبع، خدا کو اپنے اقدام میں ظالم نہیں انصاف پر قائم سمجھے گا۔ بلکہ اس کو خدا کی اتنی مہلت اور تاخیر پر حیرت ہوگی جو کہ نافرمانوں کے حق میں کام کرتی رہی ہے اور دیکھنے والے اس امہال سے خدا کے غیر معمولی تحمل اور ضبط کے قائل ہوں گے۔ پھر جس طرح آقا عام لوگوں پر اپنے محکوم کی نافرمانی کا اظہار کئے بغیر اس کو شکنجے میں کسنے کا ہر طرح مختار تھا اسی طرح اخدا بھی نافرمانیوں کی نافرمانی کا مظاہرہ کرائے بغیر ان کو عذاب دائمی میں مبتلا کر دے تو خدا پر یقیناً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ پس بلاشبہ خدا کا نافرمانوں سے نافرمانی کا مظاہرہ کرانا فرمانبردار اور سلامت روی اختیار کرنے والے بندوں پر ایک احسان عظیم ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کے اور بھی قائل و معترف ہوتے ہیں اور اعتراف کے یہ سر و سامان بہم پہنچانا اگر خدا کا احسان و کرم نہیں تو اور کیا ہے؟

جبر واختیار

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے ارادے اور اس کی تقدیر سے ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم بندے کو فاعل مختار بھی سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کو اپنے افعال میں اختیار حاصل ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے جبر واضطرار کا نتیجہ نہیں ہے اس لئے اچھے اعمال پر ثواب اور برے کاموں پر سزا بظاہر اسی اختیار پر مرتب ہوگی۔ یہاں پہلے آپ کو جبر واختیار کا مطلب سمجھ لینا چاہئے تا کہ اس مسئلہ کی حقیقت آپ معلوم کر سکیں۔ بات تو بہت طول طویل ہے لیکن مختصر یوں سمجھیے کہ افعال کا انسانوں سے صدور دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی چیز کا تصور کرتا ہے اگر وہ چیز اس کی مطلوب ہے اور اس کی طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے تو اندرونی طور پر ایک خواہش اور طلب اس میں پیدا ہوگی۔ لہٰذا وہ اپنی خواہش وطلب کی موافقت کرے گا اور مطلوب کو حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دے گا اور اگر اس کے تصور میں کوئی ایسی چیز آئی جس کی جانب اس کا رجحان نہیں بلکہ وہ اس کو ناپسند و ناگوار ہے تو اس کے قلب میں اس چیز کی جانب سے ایک ناگوار جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اپنا کام شروع کر دے گا۔

اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوگا کہ خواہش اور نفرت کے پیدا ہونے سے پہلے اس چیز کا کرنا اور نہ کرنا اس کیلئے برابر تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کو کرے اور امکان میں اس کا بھی تھا کہ نہ کرے اور یہ کرنا نہ کرنا یا مرتبہ تصور میں تھا جو فعلیت سے قریب ہے یا تصور سے قبل تھا جو کہ فعلیت سے دور کی چیز ہے، انسان کی اسی حرکت کو اختیاری حرکت کہتے ہیں اور اس پر مرتب ہونے والے افعال، اختیاری افعال کہے جاتے ہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تصور اور خواہش وطلب موجود نہ ہو اور جو حرکت صادر

ہو رہی ہے وہ خواہش وطلب کے بغیر ہو۔ جیسے کوئی رعشہ زدہ کی حرکت کہ اس کے اختیار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح کی حرکت کو جبری واضطراری کے نام سے موسوم کرتے ہیں (جب یہ تفصیل آپ سمجھ گئے تو اب سوال یہ ہے) کہ آپ اختیار سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اگر اختیار کے پہلے معنی مراد لئے تو ایسے اختیار کا انسان سے سلب کرنا اس کے ہم معنی ہے کہ کوئی یوں کہے کہ آدمی سننے کی طاقت نہیں رکھتا یا اس کو دیکھنے کی قوت حاصل نہیں ہے اگر بداہۃً اس قسم کے دعوے غلط ہیں تو پھر اس طرح کے اختیار کا انسان سے سلب کرنا بھی یقیناً غلط ہوگا اور اگر آپ انسان کی تمام حرکات وافعال کو دوسری قسم کے تحت سمجھتے ہیں تو پھر یہ ایک محسوس چیز کا انکار ہے کوئی بھی عقلمند یہ باور کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا کہ انسان کے افعال کسی جبر واضطرار کا نتیجہ ہیں لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے ارادہ، علم ازلی اور اس کی تقدیر کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی فعل، کسی آدمی سے وجود میں نہ آسکے اور وہ اس کو نہ کرے؟ کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ چاہا تھا کہ یہ فعل انسان کرے تو البتہ انسان ضرور کرے گا یا اضطراراً جیسا کہ حرکت اضطراری میں ہوتا ہے اور اگر فعل اختیاری ہے تو پھر اختیار سے بہر حال کسی طرح بھی ہو مگر ضرور کرنا ہوگا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ انسان کو فعل کے اختیار کرنے اور اسے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اگر ہے تو صرف تصور میں لانے کی حد تک ہے۔ نیز آدمی کو اگر اختیار ہے بھی تاہم فعل کے وجود میں تو اختیار نہیں ہے۔ جیسا کہ اگر ایک شخص آنکھیں کھولے ہوئے ہو اور پھر نہ دیکھے یہ بالکل ناممکن ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے اور دیکھنے وادراک کرنے کے بعد اگر وہ چیز اس کی مطلوب ہے تو پھر خواہش وطلب کا اس میں پیدا ہونا ضروری ہے اور باوجود اختیار کے حرکت کا بھی اس میں پایا جانا ضروری ہوگا۔ لہٰذا یہ اختیار واجب ولازم ہوا اور وجوب یا لزوم یہ دونوں اختیار کے بالکل منافی ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ آدمی اختیار رکھتا ہے لیکن اپنے اختیار پر اختیار نہیں رکھتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے افعال میں مختار ہے لیکن اپنے اختیار میں مجبور ہے یا اسی حقیقت

کی ایک دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ آدمی کو صورتاً اختیار حاصل ہے اور درحقیقت وہ مجبور ہے۔

اس تمام تفصیل کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ قضاء وقدر اور بندہ کا اختیار یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سوائے حیرت اور اعتراف وخاموشی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہے، اور ان تمام مسائل، میں بس کام کی بات وہی ہے جو کہ خود باری عزاسمہ نے فرمائی کہ ''ہم سے کوئی نہیں پوچھ سکتا لیکن ہم سب سے محاسبہ کریں گے'' یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور و فکر نہ کرنا چاہئے۔ چونکہ اس کے پس منظر میں ایک ''راز'' اور ایک نہایت نا قابل فہم حقیقت ہے۔ امام جعفر صادق[1] جو اہل طریقت کے استاد اور اہلِ حقیقت کے راہنما ہیں فرماتے تھے کہ ''نہ درحقیقت جبر ہے اور نہ اختیار، بلکہ ان دونوں کے درمیان میں ایک اور امر ہے (جس کو نہ جبر کی حدود میں لایا جا سکتا اور نہ اختیار کی وسعتوں میں شمار کر سکتے) جبر یہ فرقہ کہتا ہے کہ انسان کو اختیار قطعاً حاصل نہیں، مجبور محض ہے اور اس کی حرکت جمادات کی حرکت کی طرح ہے (جیسے کوئی جمادات کو حرکت دے کر اپنی جگہ سے ہٹا دے تو وہ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور اگر کوئی حرکت نہ دے تو جوں کے توں پڑے رہیں گے۔ بس انہیں کی طرح انسان بھی ہے کہ وہ نہ تو کچھ کر سکتا اور نہ اس سے کچھ ہو سکتا۔ ایک غیبی طاقت ہے جو سب کچھ کرا رہی ہے) اور قدریہ کا کہنا ہے کہ آدمی مختار مطلق ہے جو چاہے کرے، نہ کرے، افعال خود اس کی مخلوق ہیں اور وہ ہر حیثیت سے مستقل ہے۔ امام جعفرؒ فرماتے ہیں کہ بات نہ وہ ہے جو جبریہ کہتے ہیں اور نہ یہ ہے جس کے قائل قدریہ ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک ''حقیقت'' ہے جس کو عقل دریافت بھی نہیں کر سکتی۔ اگر عقل اس ''امر متوسط'' کی دریافت کی فکر بھی کرے گی تو سوائے حیرانی اور سرگردانی کے اس کو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

---

[1] جعفر بن محمد بن علی ابو عبداللہ کنیت ہے، صادق آپ کا لقب ہے آپ کی ولادت دوشنبہ کے روز ماہ ربیع الاول ۸۰ھ مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اہل بیت سے ہیں اور علم وعمل کے پیکر، ۱۵ رجب بروز دوشنبہ ۱۴۹ھ مدینہ منورہ ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔

اور یہی بات یہ ہے کہ یہ حیرانی بھی انہیں کا حصہ ہے جو عقل کو اپنا راہ نما بنائے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر معمہ عقل سے دریافت اور حل کیا جاسکے اور جب تک ان کی عقل کے خودساختہ معیار پر کوئی حقیقت پوری نہ اترے تو وہ اس کی تصدیق بھی کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے، ورنہ مومنین کیلئے تو اس مقصد کے ثبوت پر شریعت وقرآن کی شہادت کافی ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ خدا ہی کے ارادہ وقدرت سے ہے اور اس کے باوجود طاعات ومعاصی کی نسبت انسانوں کی طرف بھی کرتا ہے جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے کہ "**وما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون**" یعنی خدا ہرگز ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ "**واللہ خلقکم وما تعملون**" یعنی ہم نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے افعال کو بھی، ان آیات میں صاف طور پر خلق کی نسبت اپنی جانب ہے اور عمل کی انسانوں کی طرف لہٰذا ہم کو ایمان رکھنا چاہئے کہ خلق خدا کا کام ہے اور فعل انسان کا اگرچہ ہم اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکیں۔ نیز تکلیف احکام اور امرونہی یہ سب اختیار ہی پر مرتب ہوتے ہیں اس لئے بھی ان کا قائل ہونا ضروری ہے۔ ہم کو قضاء وقدر اور اختیار دونوں مسئلوں میں شریعت سے کچھ خاص معلومات بہم پہنچی ہیں اس لئے اب ان پر تذبذب اور ایمان نہ لانے کا کوئی سوال ہی نہیں رہا ایک امر متوسط پر عقیدہ رکھنا از حد ضروری ہے ان مسائل میں غور وفکر کرنا بھی جہالت ونادانی کی دلیل ہے، کسی مسئلہ کا ثبوت اور کسی عمل و فعل کا دارومدار ان مسائل پر نہیں ہے۔ ہم کو تو اپنے کام سے کام، حقیقت اللہ ہی[۱] بہتر جانے "**اعملوا فکل میسر لما خلق لہ.**"

---

[۱] قضاء وقدر، جبر واختیار مسئلہ مجازات، بڑے لاینحل مسائل اور ناقابل دریافت سمجھے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی شخص نے انہیں معرکۃ الآراء مسائل کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک تاریک راہ ہے اس میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کرو، سائل نے پھر سوال کیا تو ارشاد فرمایا کہ ایک ہلاکت خیز دریائے خوں ہے، اس کے قریب بھی مت جاؤ، ادھر سے پھر اصرار ہوا، تو فرمایا کہ یہ مسئلہ خدا کا ایک راز ہے۔ اس کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو، حضرت علی کا پیہم انکار، اس مسئلہ کے لاینحل، پہلو پر روشنی ڈالتا ہے

بھی ایک طرف ان مسائل کے حل نہ ہونے والے گوشے ہیں تو دوسری طرف انہیں معمول پر ایمان لانے کا پر زور مطالبہ ہے، کفر وایمان کا یہی وہ دوراہہ ہے جس پر قدم ڈالنے کے بعد یا صاف اور سیدھی سڑک پر قدم رکھتا ہوا نکل جائے گا یا پر پیچ راہ میں گم ہو کر ایمان کی کامل روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ پس بلاشبہ یہ مسائل، بہتر یہی ہے کہ بحث وتمحیص کی زد میں نہ آئیں اور غیر ضروری بحثوں کے دروازے کھول کر، حقیقت کو اور بھی مبہم کرنے کی کوشش نہ ہو، مگر کیا کیا جائے کہ انسان کی تجسس پسند فطرت ان مسائل پر بھی موشگافیوں کی طلب سے باز نہیں آتی۔ حالانکہ بات صاف تھی کہ خدا کا وجود تسلیم کرنے کے بعد ان مسائل کو ان کے گوشوں سے تفصیلی طور پر واقف ہوئے بغیر ایمان لانا بہت سہل تھا، تاہم شیخ عبدالحق کے اس تفصیلی بیان کے بعد ہماری جانب سے یہ ایک توضیحی نوٹ ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسئلہ کی یہ بے غبار حقیقت ہے لیکن ممکن ہے کہ اس سے کچھ نئے انکشافات سامنے آئیں اور کسی حد تک تشفی ہو سکے۔ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے اور یہ بھی طے ہے کہ علم ازلی کے مطابق جو کچھ ہونا ہے وہ سب کچھ تحریر میں آ چکا اور کائنات کا کوئی بھی ذرہ اب اس کے خلاف حرکت نہیں کر سکتا، اس لئے ان مذکورہ بالا حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد، بحث کا معرکۃ الآ راء گوشہ یا مرکزی نقطہ، انسان کے افعال ہی بن جاتے ہیں کہ انسان کو اب مجبور کہا جائے یا اس کو مختار تسلیم کیا جائے اگر اختیار کیلئے ثابت کیا جائے تو قضا وقدر کے سامنے مجبور ماننا کیسے صحیح ہوگا اور اگر جبر کے شکنجوں میں اس کو کسا ہوا سمجھ لیا جائے تو پھر قدرت واختیار کی صفت اس کے لئے کہاں سے ثابت کی جا سکے گی، یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ''افعال انسانی'' قضاء وقدر کے مسئلہ میں بحث کے اصلی موضوع اور ان مسائل کے حل طلب عنوان ہیں، شیخ نے جیسا کہ لکھا ہے کہ انسان میں اختیار کی صفت بھی یقینی طور پر موجود ہے جس کا انکار نعمت کا انکار ہوگا لیکن جس طرح خود اس کا وجود اور اس کی تمام صفات کمزور وضعیف ہیں، اسی طرح اس کا یہ اختیار بھی بہت ہی ضعیف ہے، پس ان صفات کے کمزور اور ضعیف ہونے کی بنا پر ان کا سرے سے انکار ہی کرنا قطعاً غلط ہوگا اور اسی طرح یہ بھی یقیناً غلط ہوگا کہ ان کو تسلیم کرنے کے بعد آخر تک ان کو تسلیم کیا جائے اس لئے ماننا پڑے گا کہ اختیار ہم میں ضرور موجود ہے لیکن اس اختیار پر ہم کو اختیار نہیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کو سمجھنے کے بعد اس دریائے خوں کی غواصی کسی حد تک ممکن ہو جاتی ہے۔ اب انسان کو چاہے مختار کہئے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے اور اگر مجبور سمجھتے ہیں تو مجبور گردانئے کہ کرتا ہے وہ وہی جو مختار مطلق اس سے کرانا چاہتا ہے مگر اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کیجئے کہ یہ جبر، جبر مطلق سے بہرحال ممتاز ہے کیونکہ مطلق جبر نہیں، مجبور اور اس کے ارادے میں مزاحمت اور کشمکش رہتی ہے لیکن یہاں ایسا نہیں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص تلوار سونت کر آپ کے سینہ پر بیٹھ جائے اور آپ کی کسی بڑی جائیداد یا بنک میں جمع کردہ کروڑ ہا کروڑ کی رقم کی تحریر اپنے لئے لکھوائے تو آپ جان کے خوف سے لکھ تو ضرور دیں گے لیکن اس جبر کے مقابلہ کا شعور اور احساس بالکل تازہ وزندہ رہے گا لیکن اپنے افعال میں انسان کا یہ معاملہ نہیں ہے وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے آپ کو بالکل آزاد اور کامل مختار سمجھ کر کرتا ہے۔ اس لئے

اس کھلے ہوئے فرق کے بعد اس جبر اور جبر مطلق کی راہیں مطلقاً جدا نظر آتی ہیں۔

اسی طرح مولف نے مسئلہ مجازات کو بھی قرآن حکیم کی ایک آیت سے حل کرنے کی کوشش کی ہے یعنی "لایسئل عما یفعل وھم یسئلون" بلاشبہ مسئلہ مجازات کے گوشوں کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے اس سے بڑھ کر تشفی بخش اور کوئی آیت ربانی نہیں ہے۔ بات صاف ہے کہ مالک وہی ہے جس کو ہر قسم اور ہمہ جہت تصرف کا پورا پورا اختیار ہو۔ آپ ایک مجازی اور بے حقیقت ملک پر تصرفات کا دائرہ کس قدر پھیلا دیتے ہیں پھر خود ہی بتایئے کہ حقیقی ملک پر تصرف کس درجہ وسیع اور اپنے اندر کتنا پھیلاؤ رکھنے والا ہونا چاہئے اور پھر جب وہ مالک کے ساتھ خالق بھی ہو تو اس کے مالکانہ تصرفات کا کیا عالم ہوگا۔ آپ کی شریعت نے اس باپ کی جان قصاصاً لینا مناسب نہیں سمجھا۔ جس نے ظلم اور پوری سفا کی سے اپنی معصوم اولاد کی جان لی۔ خالقیت کا کتنا موہوم شبہ تھا لیکن شریعت نے باپ کے حق میں اس کے نتائج کتنے اہم نکال کر سامنے رکھ دیے۔ پھر بتایئے کہ وہی ذات جو حقیقت میں آپ کی خالق ہے اور جس نے آپ کو پیدا کیا اس کو تصرف اور اختیار آپ کس قدر دینے کیلئے تیار ہیں؟ اس موقع پر حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے سورۂ کہف میں "ولا یظلم ربک احدا" کی تفسیر کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو بھی سن لیجئے۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

"رب جو کچھ کرے سو ظلم نہیں، سب اسی کا مال ہے پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا۔ بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی نہیں ضائع کرتا اور جو کوئی کہے (یعنی اعتراض کرے) گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے سو یہ بات نہیں ہے اپنے دل سے پوچھ لے جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا ہے تو قصد دونوں طرف سے لگتا ہے اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے، بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسی کو جو اس سے بدی کرتا ہے یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کرا دیا۔"

تقدیر کے لانیحل مسئلہ کو شاہ صاحب مرحوم و مغفور نے جس دل نشیں انداز میں سمجھایا ہے وہ انہیں کا حق ہے اگر آپ نے اس کو بار بار مطالعہ کیا تو بڑی حد تک ذہنی کشمکش اور تقدیر کے مسئلہ پر دماغی الجھنوں سے آپ نجات پالیں گے اور ہو سکتا ہے شک و ریب کے کانٹے جو خلش و خلجان کے خارزار میں قدم رکھنے سے پیوست ہو گئے ہیں وہ ایک ایک کر کے نکل جائیں۔

ہم نے اس توضیحی نوٹ میں مولانا بدر عالم صاحب کی تحریر سے استفادہ کیا ہے بلکہ کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد کہنا چاہئے کہ یہ انہیں کی تحریر کا خلاصہ ہے۔

ایک کام کی بات: کسی چیز کے ثبوت پر شریعت کے واضح بیانات کے باوجود اگر دل میں کچھ خلجان اور کھٹک باقی ہے تو پھر ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔ ایمان کی حقیت یہی ہے کہ شارع سے جو بھی آپ سنیں اس کی تصدیق کریں۔ اگر آپ نے ایمان ویقین، عقل کے فیصلوں پر موقوف رکھے ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ خدا پر ایمان نہیں بلکہ خود اپنے پر ایمان لانا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ جبر واختیار اور قضا وقدر کے مسئلہ انہیں نقاط پر حل کرتے اور اس کتاب کے مناسب بھی یہی تھا کہ بحث کو اسی انداز پر سمیٹا جاتا لیکن کیا کیا جائے قلم کچھ اپنے قابو سے باہر ہے چل پڑتا ہے تو پھر روکے نہیں رکتا، اس کے باوجود دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ خطاء ولغزش سے محفوظ رکھے اور راہِ ہدایت کی توفیق ارزانی ہو۔

ہدایت وگمراہی: انسان کو ہدایت فرمانا یا ضلالت وگمراہی کے تاریک گڑھوں میں ڈال دینا خدائے بزرگ وبرتر ہی کا کام ہے، جس کو چاہے سیدھی راہ دکھا دے اور اگر چاہے تو گمراہی کی اندھیریوں میں الجھا دے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس کو اس نے سیدھے راستہ پر ڈال دیا اب کوئی اس کو گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو سیدھی راہ سے بھٹکا دیا تو اب کسی کی کیا مجال کہ پھر اس کو راہِ راست پر لے آئے، قرآن حکیم میں اس طرح کے مضامین کی آیات بکثرت ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی، ہدایت کی نسبت کہیں پر قرآن اور جناب رسول اللہ ﷺ کی جانب کی گئی ہے اور کبھی گمراہی کا تعلق شیطان اور بتوں سے کردیا جاتا ہے (اس وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ ہادی کون ہے؟ اور گمراہی کس طرف سے آئی ہے۔ ان الجھے ہوئے مباحث میں بس بنیادی بات یہی ہے کہ) ہم کو دونوں پر ایمان لانا چاہئے اور قرآن کی تصریحات کے مطابق عقیدہ رکھنا چاہئے (بعض علماء نے ان معارض بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کیلئے کہا ہے کہ) ہدایت کے دو معنی ہیں، ایک راہِ راست دکھانا (جس میں منزل مقصود کا راستہ دکھا دیا جاتا ہے۔ منزل پر پہنچانا ضروری نہیں ہوتا) دوسرے معنی ہدایت کے ہیں۔ سیدھی راہ پر لے جانا اور منزل مقصود تک پہنچا دینا (پھر یہ علماء کہتے ہیں جبکہ ہدایت کے یہ دو معنی سمجھ لئے گئے تو اب سمجھیے کہ جب کبھی) ہدایت سے مراد منزل مقصود تک پہنچانا ہو تو اس کی نسبت خداوند قدوس کی

طرف ہوگی۔ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا شخص منزل تک پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا اور ہدایت کے معنی اگر یہ لئے جائیں کہ سیدھا راستہ دکھانا تو ایسی ہدایت قرآن و رسول دونوں کیلئے ثابت ہے۔ چونکہ یہ دونوں سیدھا راستہ دکھا سکتے ہیں لیکن منزل تک پہنچا نہیں سکتے، اب قرآن حکیم کے متعارض بیانات میں تطبیق دی جاسکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ رسول امامِ ہدایت ہے اور شیطان ضلالت و گمراہی کا تاریک نشان ہے، اور اس کے باوجود سب کچھ خدا ہی کرتا ہے اور وہی کرسکتا ہے[1]۔

---

[1] حضرت شاہ صاحب نے ہدایت کے سلسلہ میں دو معنی بیان فرما کر علماء کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق قرآن کے معارض بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے، بعض علماء کی رائے میں وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھئے بیان کیا گیا ہے کہ ہدایت کی نسبت جب خدا کی طرف ہو تو اس سے مراد منزل مقصود تک پہنچانا ہوگا جس کے بعد بھٹک جانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں صاف طور پر موجود ہے "واما ثمود فهدينا هم فاستحبوا العمىٰ على الهدىٰ" یعنی ثمود کو ہم نے ہدایت کی لیکن ان کور بختوں نے ہدایت پر گمراہی کو پسند کیا' یہاں پر ہدایت کی نسبت خداوند قدوس کی طرف ہے، اگر منزل مقصود تک پہنچ جانا اور پھر نہ بھٹکنا، ہدایت خداوندی میں ضروری تھا تو ثمود راہِ راست سے کیوں بھٹک گئے؟ بعض علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ منزل تک پہنچ جانے کے بعد انہوں نے ارتداد کیا جس کی وجہ سے وہ بھٹک گئے ورنہ اللہ تعالیٰ نے مقصود تک ان کو یقیناً پہنچادیا تھا۔ اس اشکال کے جواب کیلئے علماء نے جو کچھ کہا یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ تفسیری کتب اور سرمایہ سے ثابت ہے کہ ثمود اکثر ایمان نہیں لائے تھے اور جس قلیل تعداد نے ایمان قبول کیا تھا وہ مرتد نہیں ہوئی بلکہ اپنے ایمان پر قائم رہی ہے۔

اور ہدایت کے دوسرے معنی جو بیان کئے گئے ہیں یعنی جب ہدایت کی نسبت آنحضورؐ یا قرآن کی طرف ہوگی تو اس سے صرف راہ نمائی مراد ہوگی منزل تک پہنچانا مراد نہ ہوگا، یہ معنی بھی قرآن کے اس بیان کے بعد کہ "انک لا تهدی من احببت" ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کا کام ہی راہ دکھانا تھا اور اس آیت میں اسی کا انکار کیا جارہا ہے اس اشکال کی عقدہ کشائی کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ "جس کو تو راہ دکھانا چاہے اپنی مرضی سے نہیں دکھا سکتا۔ تاوقتیکہ ہمارا ارادہ شامل نہ ہو، قطعاً تکلف ہے جس کو ذوقِ سلیم گوارا نہیں کرتا، زمخشری نے اس الجھے ہوئے مبحث میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہدایت دونوں معنی میں مشترک ہے۔ کبھی ہدایت کے معنی منزل تک پہنچانا لئے جاتے ہیں اور گاہے راہ نمائی ہدایت کے معنی قرار دئے جاتے ہیں۔

بعض وجوہ کی بنا پر زمخشری کی یہ تحقیق، درست معلوم ہوتی ہے، ورنہ دوسری توجیہات، اشکالات سے محفوظ نظر نہیں آتیں۔

عالم برزخ

اہل سنت والجماعت کے عقائد میں ایک عذاب قبر کا عقیدہ بھی ہے، قبر سے مراد عالم برزخ ہے، جو اس دنیا اور آخرت کی درمیانی منزل کا نام ہے، اسی درمیانی منزل میں کفار اور مومنین کی وہ جماعت جو دنیاوی زندگی میں خدا کی چھوٹی بڑی نافرمانیوں کی مرتکب ہوئی ہے عذاب ومحن میں رہے گی اور خدا کے فرمانبردار بندے اس عالم برزخ میں نعمتوں سے سرفراز کیے جائیں گے۔ منکر اور نکیر دو ہیبت ناک شکل وصورت کے فرشتے جن کا رنگ نہایت سیاہ اور آنکھیں بالکل نیلی ہوں گی قبر میں مردے سے خدا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے سلسلہ میں اور مردے کے دین کے متعلق سوالات کریں گے۔ اگر اللہ کی توفیق شامل حال رہی تو اس کی تعلیم سے ان سوالات کا جواب مردہ ٹھیک ٹھیک اور حق کے مطابق دے گا (پھر اس امتحانی مرحلہ میں کامیاب ہونے کے بعد) ایسے ناز وانداز اور راحت وسکون سے اس کو رکھا جائے گا جیسا کہ کوئی دلہن بے فکری کے ساتھ پڑی سوتی ہو، اور قبر کا یہ (پرسکون گوشہ) اس کیلئے جنت کے دل فریب باغات میں سے ایک حسین باغ ہو جائے گا۔

اور اگر ان سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دے سکا، تو قبر کا یہ (تاریک ترین حصہ) جہنم کے گڑھوں میں سے اس کیلئے ایک گڑھا ثابت ہوگا۔ قرآنی آیات اور احادیث اس سلسلہ میں تصریحات پیش کرتی ہیں۔ لہٰذا اس پر ایمان لانا چاہئے۔ اب یہ کہ عذاب کی صورت کیا ہوگی آیا روح کو دوبارہ جسم میں لوٹایا جائے گا یا صرف روح پر ہوگا یا اور کوئی صورت اختیار کی جائے گی؟ یہ تمام خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوگا؟ اہل سنت والجماعت کے یہاں حقائق کا ادراک شرط نہیں ہے۔ تفصیلات بے مصرف ہیں۔

ہاں بعض علماء نے لکھا ہے کہ منکر ونکیر عذاب کے فرشتے ہیں جو فرشتے مطیع بندوں کے پاس بھیجے جائیں گے۔ ان کے نام مبشر اور بشیر ہیں لیکن احادیث میں اس تفصیل کا کوئی ذکر نہیں عموماً احادیث میں صرف منکر اور نکیر ہی کا نام آتا ہے، بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مردہ سے سوال کرنے والی جماعت نہایت بڑی ہو جن میں سے بعض کا نام منکر ہو اور دوسری جماعت کا نام نکیر ہو، اور ہر مردہ کے پاس ان میں سے دو بھیجے جائیں جیسے کہ اعمال کی کتابت وتحریر کے سلسلہ میں ہر انسان پر دو دو فرشتے متعین ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ منکر ونکیر دو ہی شخص ہوں جو سینکڑوں جگہ ایک ہی وقت میں متمثل ہو کر آئیں۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ (نامی کتاب کے مصنف) اور بزازی نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ قبر میں مردہ کو رکھنے کے ساتھ ہی سوال و جواب شروع نہیں ہوتے بلکہ جب جنازہ کے ساتھ چلنے والے دفن کرنے کے بعد چلے آتے ہیں تو پھر منکر ونکیر اپنا کام شروع کرتے ہیں اور جب کسی مردہ کو تابوت میں رکھ کر کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو تو تابوت ہی میں اس سے سوال نہیں ہوتا (بلکہ جب قبر میں دفن کردیا جاتا ہے تو پھر حساب وکتاب شروع ہوتا ہے) لیکن اگر درندہ کھا جائے تو پھر درندہ ہی کے پیٹ میں سوال و جواب ہوتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی سوال ہوتا ہے یا نہیں تو صحیح قول یہی ہے کہ ان سے سوالات نہیں کئے جاتے اور اگر ہوتے ہیں تو صرف تعظیماً توحید کے سلسلہ میں اور امت کے احوال کے متعلق کچھ پوچھ لیا جاتا ہے لیکن مومنین کے بچوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر وبیشتر علماء کی رائے یہ ہے کہ مومنین کے بچوں سے سوال ہوگا لیکن سوال کے بعد جواب خود فرشتے ہی سکھاتے ہوئے کہیں گے کہ یوں کہو "میرا رب خدا ہے، میرا دین اسلام ہے، آنحضور ﷺ پیغمبر ہیں وغیرہا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان سوالات کے جواب اللہ ہی کی جانب سے ان کو سکھلائے جائیں جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو گہوارہ میں سوالات کے جوابات کا الہام اللہ ہی کی طرف سے ہوا۔

(بہرحال بچوں کے ساتھ جو بھی معاملہ ہوگا وہ صرف ضابطہ کی کارروائی ہوگی ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تو مکلف ہی نہیں تھے کہ ان سے سوال و جواب ہو) مشرکین کی اولاد کے بارے میں امام ابوحنیفہ نے دلائل کے تناقض اور معارض بیانات کی وجہ سے سکوت فرمایا ہے اور کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے۔ امام صاحب کے علاوہ بعض کہتے ہیں کہ یقیناً وہ بھی اپنے ماں باپ کی طرح جہنمی ہیں اور بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ جنتی ہیں۔ محمد بن حسنؒ تو بڑے یقین کے ساتھ کہتے تھے کہ بے گناہ پر خدا ہرگز عذاب مسلط نہ کرے گا۔ (اس لئے ان کے خیال میں مشرکین کی اولاد کے عذاب کا تصور ہی غلط ہے چونکہ نہ انہوں نے کوئی گناہ کیا اور نہ ان سے کوئی لغزش ہوئی، اور ماں باپ کی بد اعمالیوں کے نتیجہ میں گرفتار آلام ومحن ہونا تو یہ ہرگز مناسب نہیں ہے، خدائی قانون ہے کہ کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا، اس لئے یہ کیسے مان لیا جائے کہ ماں باپ کی بداعمالیاں ہوں اور نتائج اولاد کو بھگتنا پڑیں۔)

جنات کے متعلق بیشتر علماء کی رائے ہے کہ ان سے سوال ہوگا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ احادیث جو عذاب قبر کے سلسلہ میں آنحضورﷺ سے ہم تک پہنچی ہیں وہ بالکل عام ہیں۔ اس لئے جنوں کا استثناء کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، ہاں امام اعظمؒ نے مسلمان جنوں کے ثواب کی کیفیت کے سلسلہ میں سکوت کیا ہے (یعنی ان سے اس کی تصریح نہیں ملتی کہ مسلمان جنوں کو ان کے حسن اعمال کی جزاء کیا اور کس طرح دی جائے گی) لیکن کفار جنات کے بارے میں سب کہتے ہیں کہ وہ عذاب دیئے جائیں گے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتا۔

ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کافر جس کا کفر عیاں تھا اور جس کو اپنے کفر پر اصرار بھی تھا اس سے قبر میں کوئی سوال نہ ہوگا بلکہ بغیر سوال و جواب ہی کے اس پر عذاب شروع ہو جائے گا، منافقین سے ضرور سوال و جواب ہوگا۔ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ایسی احادیث بھی ہیں جس میں شہید، فی سبیل اللہ جدوجہد کرنے والے، ہر جمعہ کو یا جمعہ کی رات میں وفات پانے والے، سورۂ ملک پڑھنے والے، استسقاء کی بیماری میں مرنے

والے اور اسہال کے مرض میں جان دینے والے کا اس سوال و جواب سے استثناء کا ثبوت ملتا ہے۔ (ترمذی)۔

اور ابن عبد البرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سوال قبر، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات میں سے ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ عذاب میں عجلت کی حکمت یہ ہے کہ کئے ہوئے گناہوں کا عذاب وغیرہ برزخ میں بھگتنے کے بعد قیامت کے روز پاک وصاف اٹھیں۔ شرح عقیدہ طحاوی میں بھی اس کی تصریح ہے اور اس سلسلہ میں تعمیمؔ و توقف سے بھی کام لیا گیا ہے۔

نیز احادیث میں یہ بھی ہے کہ گنہ گار کی قبر میں ستر بچھو، اور زہریلے اژدھے، میت پر مسلط کئے جائیں گے، یہ ایسے خوفناک اور زہریلے ہوں گے کہ اگر ان میں سے کوئی پھونک ماردے (پھنکاردے) تو تمام دنیا اور دنیا کے نباتات، اشجار جل کر ختم ہو جائیں، یہ اصل میں انسان کے برے اعمال، بری صفات و عادات اور دنیا کے غیر پسندیدہ تعلقات ہیں جو اس برزخ میں سانپ اور بچھوؤں کی صورت اختیار کرلیں گے اور ان احادیث میں ستر کا عدد ذکر ہے تو شاید اس سے مراد (کوئی متعین ستر ہی کا عدد نہ ہو بلکہ سانپ واژدہے وغیرہ کی) کثرت مراد ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شارع صفات کی تعداد سے واقف ہو اور صفات کی تعداد ستر ہی ہو۔

(عذاب قبر کے سلسلہ کی بعض احادیث میں ہے کہ ۹۹ سانپ خوفناک اور زہریلے گنہگار پر مسلط کئے جائیں گے اور دوسری روایات میں ستر کا بھی عدد مذکور ہے، اگرچہ ۹۹ یا ستر کے عدد کے بارے میں آنحضور ﷺ سے کوئی ایسی تفصیل نہیں ملتی جس کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکے کہ زہریلے کیڑے اسی تعداد میں کیوں مسلط کئے جائیں گے، تاہم محدثین نے کچھ وجوہات اپنے اپنے مذاق کے مطابق ضرور ذکر کی ہیں، تورپشتی شارح مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کا صرف ایک حصہ، دنیا میں بھیجا جس کی بنا پر ہم حیوانات، انسان، جنات اور بہائم میں باہمی الفت اور رحم کا جذبہ ایک دوسرے کیلئے دیکھتے ہیں اور کافر نے چونکہ خدا کے احکام سے روگردانی کی اور اس کو اپنا حقیقی معبود سمجھنے سے انکار کیا۔ گویا کہ وہ ان ۹۹ رحمتوں کا منکر ہے اس لئے ہر رحمت اس کے حق میں

عذاب بن جائے گی جس عذاب کی ۹۹ صورتیں ہوں گی اور بعض دوسرے شارحین حدیث کہتے ہیں کہ خدا کے ۹۹ اسماء ہیں جن میں سے ہر اسم کسی نہ کسی صفت پر دلالت کرتا ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے، کافر نے جب کفر اختیار کرتے ہوئے ان صفات کا انکار کردیا تھا اس پر صفات کے عدد کے مطابق ۹۹ اژدہے مسلط کردیئے گئے اور جن احادیث میں ستر کا عدد ذکر کیا گیا ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایمان کے ستر شعبے ہیں کافر نے جب ان کا انکار کیا تو اسی کے مطابق اس پر سانپ مسلط کر دیئے گئے۔ بہرحال یہ تمام توجیہات نکات بعد الوقوع کی حیثیت رکھتی ہیں، شاہ صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے یعنی یہ صفات ذمیمہ واخلاق قبیحہ ہیں جو وہاں سانپ اور بچھوؤں کی صورت اختیار کرلیں گے، یہ امام غزالی کا خیال ہے جس کو شاہ صاحبؒ نے نقل کیا ہے۔ غزالی یہ بھی لکھتے ہیں کہ ستر اور ۹۹ کا عدد صرف کثرت کو بیان کرنے کیلئے ہے اس لئے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے یا ۹۹ کا عدد کافر غنی کیلئے ہے اور ستر کی تعداد کافر فقیر پر متعین کی جائے گی چونکہ فقیر کافر کا عذاب غنی کافر کے مقابلہ میں ہلکا ہوگا۔)

ایمان وعقیدہ کے سلسلہ میں ایسی اور اس طرح کی جو دوسری باتیں آنحضورﷺ سے منقول ہیں ان پر ایمان لانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس کا یقین رکھیں کہ واقعہ اور حقیقت میں یقیناً سانپ اور اژدہے ہیں جو میت کو محسوس طور پر ڈسیں گے۔ اگرچہ ہم ان کو دیکھ نہ سکیں چونکہ ان آنکھوں سے برزخ کے معاملات ومناظر کو دیکھنا ہر شخص کیلئے ممکن نہیں شاید انبیاء اور بعض اولیاء ان ہیبت ناک مناظر کو دیکھ پائیں (اور اس کو تسلیم کرنے میں تامل بھی کیا ہوسکتا ہے) جبرئیل علیہ اسلام کو آنحضورﷺ دیکھتے تھے؟ لیکن آپ ﷺ کے علاوہ کوئی اور ان کو نہیں دیکھ پاتا تھا (بس اسی طرح یہ سانپ واژدہے خاص خاص انسان اگر ان کو دیکھ پائیں تو اس میں کیا قباحت ہے اور پھر یہاں پر یہ بات بھی نہ بھولنا چاہئے) کہ دیکھنا، دکھانا سب خدا ہی کی قدرت سے ہے، خواہ مرئی شئے اجسام سے ہو یا ارواح سے اگر آپ کے سامنے فلک بوس پہاڑ ہے لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو نہیں دکھانا چاہتا (تو یقین رکھئے کہ) آپ اسے کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے اور اگر وہ دکھانا چاہے تو ارواح ایسی لطیف اشیاء کو بھی دکھانے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے (لہٰذا ہم

دیکھیں یا نہ دیکھ سکیں ایمان بہر حال رکھنا چاہئے) ایمان اور صحت عقیدہ کا یہ امتحان ہے (اور اس امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش سب کو کرنی چاہئے) اور دوسری راہ یہ ہے کہ آپ عقیدہ رکھیں کہ اژدہاؤں کا دیکھنا کاٹنا، سانپوں کا ڈسنا، خواب کی طرح ہے، جیسے کہ آدمی خواب میں دیکھتا ہے کہ مجھے سانپ ڈس رہے ہیں اور وہ ان کی اذیت محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ واقعہ میں نہ سانپ ہوتا ہے اور نہ اس کا ڈسنا، بس اسی طرح یہ بھی خواب ہی کی سی کیفیت ہے واقعہ میں ہو نہ ہو۔ اس سلسلہ کی چیزوں پر ایمان و عقیدہ کی یہ دو صورتیں تھیں، آخری صورت ایمان کے ضعف کی علامت ہے اور پہلی صورت پر ایمان لانا قوی الایمان ہونے کی دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆
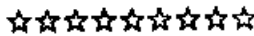
حواشی

---

۱ احادیث میں منکر اور نکیر کا حلیہ کچھ اسی طرح بیان کیا گیا ہے یا تو واقعی وہ ایسے ہی ہوں گے چونکہ سیاہی میں جو وحشت و دہشت ہے وہ دوسرے رنگوں میں موجود نہیں ہے، یا پھر دہشت انگیز منظر اور خوفناک شکل وصورت کی طرف اشارہ ہے، آدمی جب اپنے دشمن کو دیکھتا ہے تو نہایت ہی غصہ بھری نظریں ڈالتا ہے۔ اس غیظ وغضب کے عالم میں، سیاہی جو آنکھوں میں ہے چھپ جاتی ہے اور سفیدی سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا کبودچشمی سے غصہ اور غضب کا اظہار مقصود ہے۔ اردو میں بھی محاورہ ہے کہ نیلی پیلی آنکھیں کیوں کر رہے ہو، دوسری بات یہ ہے کہ عرب کے شدید دشمن روم والے اور رومی کبودچشم ہوتے تھے، اس لئے منکر اور نکیر کو کبودچشم کہنا عرب کے خیال کے مطابق ٹھیک ہوگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ منکر ونکیر کا یہ حلیہ عرب کے ماحول کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ وہاں ایسے شکل وصورت والے مہیب سمجھے جاتے ہیں، خاص اسی شکل وصورت کے فرشتے قبر میں آئیں گے یہ ضروری نہیں بلکہ ہر ماحول میں جس شکل وصورت کو خوفناک و ہیبت ناک سمجھا جاتا ہو اسی سے ملتے جلتے فرشتے قبر میں اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ منکر بالفتح اور نکیر ان دونوں کے معنی اجنبی غیر مانوس اور ناآشنا کے ہیں۔

۲ یہی حدیث جس کو عذاب قبر کے سلسلہ میں عام طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ:

مومن مردہ سوال وجواب میں پورا اترا تو اس سے فرشتہ کہیں گے کہ اس طرح سو جاؤ جیسے کہ نئی دلہن یا دولہا سوتا ہے جس کو اس کے اہل میں وہی جگاتا ہے جو سب سے زیادہ محبوب ہو، چونکہ عام طور پر ہر کسی کے جگانے اور بیدار کرنے سے، تکلیف ہوتی ہے اور اگر محبوب جگائے تو اس سے بجائے کلفت واذیت کے راحت وسرور ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ پھر شب زفاف میں دلہن کو جگانے کا فریضہ اکثر و بیشتر شوہر ہی انجام دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ شوہر ہی عورت کیلئے سب سے محبوب شخصیت ہے۔

۳ ابن قیمؒ نے کتاب الروح ص ۱۳۱ میں لکھا ہے کہ یہ مسئلہ طے شدہ نہیں ہے اور نہ کسی ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دی جا سکتی ہے، امام احمد بن حنبل کی بھی اس مسئلہ میں دو رائیں ہیں، ایک رائے ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے نہیں ہوتا اور دوسری رائے یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی طرح ان سے بھی یہ متعین سوالات کئے جاتے ہیں۔

۴ ابوعبداللہ محمد بن حسن ۱۳۹ھ میں واسط میں پیدا ہوئے، فقہ امام ابوحنیفہ اور ابی یوسف سے حاصل کیا، فقہ حنفی کی اشاعت اور اس کی تدوین میں ان کا بڑا حصہ ہے، بہت سی نادر تصانیف ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ گفتگو اس قدر فصیح ہوتی کہ سننے والا سمجھتا کہ شاید قرآن مجید انہیں کی لغت میں نازل ہوا ہے۔ ۱۸۹ھ میں وفات ہوئی۔

۵ یوسف بن عبدالبر القرطبی، علماء مغرب میں سے ہیں، جمعہ کے روز ربیع الاول ۱۸ ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے، خطیب بغدادی معاصر ہیں، استیعاب اور جامع بیان العلم وفضلہ ان کی مفید تصانیف ہیں، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کا علم وفضل، خطیب بیہقی اور ابن حزم سے کم نہیں تھا بلکہ فضل وکمال کے بعض گوشے ایسے ہیں جن میں ابن عبدالبرؒ کے مقام تک کسی کی رسائی نہیں ۲۹ ربیع الآخر بروز جمعہ ۴۶۳ھ میں وفات ہوئی۔

۶ تعمیم کا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ طحاوی کے مصنف کی رائے میں سوال قبر، امت محمدیہ ہی کے خصائص میں سے نہیں ہے بلکہ تمام امم کے حق میں یکساں ہے اور توقف کا مطلب یہ ہوگا کہ مصنف مذکور نے اس بحث میں توقف کو بہتر سمجھا ہے نہ وہ ابن عبدالبر وغیرہ کی طرح امت محمدیہ کی خصوصیات میں اس کو شمار کرتا ہے اور نہ ابن عبدالبر کی تصریحات کا انکار کرتا ہے۔

حشر ونشر

اسلامی عقائد میں ایک بنیادی عقیدہ یہ بھی ہے کہ خداوند تعالیٰ مُردوں کو قبر سے اٹھائے گا اور مخلوق مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کی جائے گی، قرآن واحادیث اس سلسلہ میں ناطق ہیں اور عقائد میں اس عقیدہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، سوچنے کی بات ہے کہ جو قادر توانا ایک معدوم محض کو وجود میں لاسکتا ہے اور جس نے اپنی بے پناہ قدرت سے معدوم شئے کو وجود کا لباس عطا کیا، کیا وہ دوبارہ اٹھانے اور مار کر پھر جلانے پر قادر نہ ہوگا؟

بلاشبہ عقل باور کرتی ہے کہ خداوند کریم بعث بعد الموت پر قادر ہے اور عقلاً ونقلاً اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، وہ خود اپنے متعلق کہتا ہے کہ

"وهو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیده وهو اهون علیه"

وہی پہلی بار بناتا ہے اور پھر وہی دوبارہ بنائے گا اور یہ امر اس کیلئے بہت آسان ہے۔

احادیث میں ہے کہ:

انسان کا تخم (بیج) جو اس کے نشوونما کا باعث ہوتا ہے جس کو "عجب الذنب" کہتے ہیں باقی رکھا جائے گا۔ یہ قبر میں اسی طرح محفوظ رہے گا، جیسا کہ بیج زمین میں پنہاں رہتا ہے۔ پھر آسمان سے پانی برسے گا تو جس طرح صحرا میں بارش سے گھاس وغیرہ اگ آتی ہے ایسے میں مردے بھی زمین سے اٹھ آئیں گے۔ انسانوں کے علاوہ تمام حیوانات، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے، چوپائے، درندے، غرضیکہ سب پیدا کئے جائیں گے۔

امام احمد بن حنبل اور مسلم رحمہما اللہ نے ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ روزِ قیامت میں مخلوق ایک دوسرے سے قصاص لے گی، اگر کسی سینگ والی بکری نے کسی ایسی بکری کو مارا ہو جس کے سینگ نہ تھے تو بے سینگ والی، سینگ والی سے ضرور بدلہ لے گی، تا آنکہ چیونٹی نے کسی چیونٹی کو تکلیف پہنچائی ہو گی تو وہ بھی اپنا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔

ان احادیث سے قصاص کی جو صورت ثابت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قصاص کا دارومدار تکلیف وشعور پر نہیں ہے۔ اگر تمیز وتکلیف پر قصاص کا مدار ہوتا تو ظاہر ہے کہ حیوانات ایک دوسرے سے کس طرح بدلہ لیتے؟ اس بناء پر بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر بچپن میں کسی بچے سے دوسرے بچے کو تکلیف پہنچی ہو۔ اور پھر وہ بلوغ وشعور سے پہلے مر گئے ہوں تو وہ بھی باہمی طور پر ایک دوسرے سے اپنا بدلہ لیں گے۔ واللہ اعلم

قصاص کے بعد تمام جانور پھر معدوم کر دئے جائیں گے اور جن جانوروں کا شرعاً کھانا جائز تھا اور ان کو کھایا گیا تو ان کی خاک بہشت کی خاک بنادی جائے گی۔

نفخ صور: بعث ونشر، صور کے پھونکے سے ہوگا، قیامت کے آغاز وشروع میں صور پھونکا جائے گا، اس کا اثر یہ ہوگا کہ زمین وآسمان میں شدید قسم کی دہشت ووحشت پھیل جائے گی اور تمام جاندار ہلاک ہو جائیں گے۔ نفخ صور کے سلسلہ میں قرآن مجید میں یہ آیات ملتی ہیں ایک موقع پر فرمایا گیا ہے کہ:

"ویوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السموٰات ومن فی الارض الامن شاء اللہ"

"جس دن صور پھونکا جائے گا، سو تمام آسمان وزمین والے گھبرا جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"ونفخ فی الصور فصعق من فی السموٰات ومن فی الارض الا من شاء اللہ" (القرآن)

"اور قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا تو تمام آسمان وزمین والے بے ہوش ہو جائیں گے۔ مگر جس کو خدا چاہے وہ بے ہوشی سے محفوظ رہے گا۔"

پھر دوسری مرتبہ قبروں سے مُردوں کو اٹھانے کیلئے صور پھونکا جائے گا، اس کے اثر سے تمام مُردے قبروں سے نکل کر پھیل جائیں گے۔ مذکورہ بالا آیت سے متصل ہی اس کی اطلاع دیتے ہوئے ارشاد ہے کہ:

"ثم نفخ فیه اخریٰ فاذاهم قیام ینظرون" (القرآن الحکیم)

"یعنی پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو دفعتاً سب زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔"

اس کے علاوہ یہ ایک آیت اور ہے کہ:

"ونفخ فی الصور فاذاهم من الاجداث الٰی ربهم ینسلون"

"اور دوبارہ صور پھونکنے پر لوگ قبروں سے نکل کر خدا کی طرف دوڑیں گے۔"

ان دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کی مدت کا وقفہ ہوگا، ہاں ان آیات میں اتنی بات قابل غور ہے کہ بظاہر خداوند کریم کے اس ارشاد یعنی تمام آسمان و زمین والے نفخ صور پر بے ہوش ہو جائیں گے۔ اور دوسری آیت یعنی "مگر جس کو خدا چاہے وہ بے ہوشی سے محفوظ رہے گا" میں اختلاف نظر آتا ہے۔ علماء نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ پہلی آیت سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ صور کے اثر سے زمین و آسمان والے، جن اور ملائکہ کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا اور "الا من شاء اللہ" سے جبرئیل، مکائیل، اسرافیل، عزرائیل، حوریں، خازن، جنت اور عرش کے اٹھانے والے فرشتے، شہداء وغیرہ کا استثناء ضروری ہے یعنی نفخ صور کا ان پر اثر نہ ہوگا اور ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض علماء "نفخۂ احیاء" کو قیامت کہتے ہیں اور اس سے ایک طویل مدت مراد لیتے ہوئے موت کے عام سناٹے سے لے کر بہشت میں داخل ہونے تک درمیانی تمام عرصے کو قیامت ہی سمجھتے ہیں۔

قیامت کا نمونہ: ذرا دیدۂ عبرت سے کام لیجئے تو آپ کی یہ دنیا ہر وقت قیامت کا

ایک منظر پیش کرتی نظر آئے گی۔ لیکن اس کے باوجود انسان قیامت کی جانب سے کس درجہ غافل ہے حدیث میں ہے کہ جب شام ہوتی ہے تو گھبراہٹ اضطراب، وحشت اور سراسیمگی تمام انسانوں اور جانوروں میں پھیل جاتی ہے، سب اپنے گھروں یا آشیانوں اور گھونسلوں میں گھس جاتے ہیں رات کا سناٹا، نیند کی غفلت، موت و ہلاکت ایک تصویر ہے، بس ایسا نفخہء اولیٰ ہوگا جس کا مظاہرہ شام سے لے کر سونے کے وقت تک ہوتا ہے پھر اچانک صبح اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ آ کھڑی ہوتی ہے تو سب اٹھ بیٹھتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں اور ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں، یہ نفخہء ثانیہ کا منظر ہے، جس کو آپ کی ہنگاموں سے لبریز صبح پیش کرتی ہے، (بہرحال سب کچھ یہاں ہو رہا ہے، دکھایا جا رہا ہے لیکن غفلت ہے کہ کسی طرح ختم نہیں ہوتی) قل ان القادر یحیی ویمیت والیہ النشور.

حساب و کتاب: قیامت میں تمام بندوں کا حساب و کتاب اور ان کا وزن یقیناً ہوگا اگرچہ بندوں کے اعمال و افعال سب کا علم خداوند علیم و سمیع کو رتی رتی کا ہے، تاہم اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ خود بندوں کو اپنے اعمال کے بارے میں علم ہو جائے، دوسرے اس کے علاوہ اور کچھ حکمتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، یہ میزان (ترازو) کیسی ہوگی، اعمال کو کیونکر وزن کیا جائے گا؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن جو کچھ علماء نے اس سلسلہ میں کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ''میزانِ اعمال'' حقیقۃً ترازو ہوگی اس کے دو پلے ہوں گے اور ایک زبان بھی ہوگی، ہر ایک پلہ آسمان و زمین کے برابر ہوگا۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ اگر اس کے ایک پلہ میں زمین و آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے رکھ دیا جائے تو وہ سب کچھ اس میں سما جائے گا، حسنات کا پلہ عرش کی دائیں جانب اور جنت کے مقابل ہوگا۔ برائیوں کا پلہ عرش کی بائیں جانب اور جہنم کے آمنے سامنے ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ میزان سے ایک ایسی چیز مراد ہے جس سے اعمال کا وزن معلوم کیا جا سکے اور بعض کہتے ہیں کہ میزان صرف ایک تمثیل ہے ورنہ اس سے مراد عدل و انصاف (یعنی خدا کا مقصود میزان سے یہ بتانا ہے کہ ہم اعمال کے فیصلے بالکل صحیح

اور انصاف کے ساتھ کریں گے، رہی میزان وغیرہ سو یہ تو مثال کے طور پر اس حقیقت کو سمجھانے کیلئے ذکر کی گئی ہے۔ یہ آخری توجیہ عقل کی حیلہ سازی ہے، ظاہر حدیث پر ایمان لانا چاہئے۔ ان عقلی موشگافیوں پر توجہ بڑے خسارہ کا باعث ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ کیا اعمال وزن کئے جائیں گے؟ یا صحائف اعمال کا وزن ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند کریم قادر ہے ہوسکتا ہے کہ وہ اعمال کو متشکل کر دے اور اس طرح اعمال حسنہ، نورانی جسم اختیار کر جائیں اور انہیں کا وزن ہو۔ برائیاں اور بد عملی ظلمانی شکل وصورت میں آجائیں اور ان کو تولا جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحائف اعمال میں خداوند تعالیٰ بوجھ (ثقل) اور ہلکا پن (خفت) پیدا کر دے اور پھر ان کو تولا جائے بطاقہؐ والی حدیث سے دوسرے رجحان کی تائید ہوتی ہے۔

بطاقہ، کاغذ کے پرزہ کو کہتے ہیں جس میں اشیاء کی قیمت لکھی جائے۔ (بیجک) حدیث میں بطاقہ سے مراد یہ ہے کہ جب حسنات کا پلہ ہلکا ہوگا (یعنی کسی کے اعمال حسنہ نہ ہوں گے) تو کاغذ کا ایک پرچہ جس میں ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا ہوگا نکال کر اس پلہ میں ڈال دیا جائے گا اس کے ڈالنے کے ساتھ ہی حسنات کا پلہ جھک جائے گا اور (اس طرح اس کی نجات ہو جائے گی) وہاں بعض علماء نے مختلف احادیث میں مطابقت پیدا کرنے کیلئے کہا ہے کہ اعمال اور صحائف اعمال دونوں ہی تولے جائیں گے، علماء کی اس رائے کے مطابق پھر متعدد احادیث میں کوئی اختلاف نہیں رہتا۔

قرآن کی اس آیت میں ہے کہ:

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ

''اور رکھیں گے ہم ترازوئیں ... قیامت کے دن''

موازین میزان کی جمع استعمال ... ہے۔ (ترازوئیں) اس لئے بعض علماء کی رائے میں ہر امت کی ترازو جدا ہوگی۔ اس لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور بعض کے خیال میں ہر شخص کی ترازو علیحدہ ہوگی یا ہر طرح کے عمل کیلئے ایک مستقل ترازو ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ متعدد بار تولنے یا پھر ترازو کی عظمت کی وجہ سے جمع کا صیغہ استعمال

کیا گیا ہو، بہرحال کچھ بھی ہو میزان پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں کے نام ہائے اعمال میں حسنات کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں تو ان کے اعمال کا وزن صرف ان کے شرف کے اظہار اور ان کی عزت افزائی کیلئے ہوگا، اسی طرح جن کے اعمال نامے بداعمالیوں سے سیاہ ہیں ان کو تولنا محض برسرعام رسوائی اور تشہیر کی خاطر ہوگا، کفار کے اعمال کے وزن کی بھی حکمت یقیناً یہی ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کافر کے کچھ اعمال بظاہر اچھے ہوں تو شاید ان کی وجہ سے، عذاب ومحن میں تھوڑی بہت تخفیف ہو جائے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ آخرت کی اس میزان (ترازو) کا بھاری ہونا اور ہلکا ہونا دنیا کی ترازو کے خلاف ہوگا۔ یہاں تو کسی چیز کے بھاری اور ثقیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس پلہ میں وہ چیز رکھی ہوئی ہے وہ جھک جائے اور مقابل کا پلہ اوپر کی جانب اٹھ آئے اگر ایسا ہے تو آپ جھک جانے والے کو بھاری اور اٹھنے والے پلہ کو ہلکا قرار دیں گے لیکن آخرت میں ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ وہاں اٹھنے والا پلہ بھاری اور جھک جانے والا ہلکا سمجھا جائے گا۔

اعمال نامے: احادیث وقرآن میں جس کتاب کا ذکر بکثرت آتا ہے کہ اس میں بندوں کے اچھے اور برے اعمال لکھے ہوئے ہوں گے۔ اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ مومنین کو ان کے نام ہائے اعمال دائیں ہاتھ میں دئے جائیں گے اور کافروں کو بائیں ہاتھ میں اس طرح کہ ان کے بائیں ہاتھ پشت کے پیچھے لگا دئے جائیں گے یہ اس لئے ہوگا تاکہ اس روز کفار ومومنین میں امتیاز ہو سکے اور مومنین کے امتیاز واعزاز اور مشرکین کی ذلت ورسوائی کا مظاہرہ ہو سکے۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ دائیں ہاتھ میں اعمالنامے صرف اطاعت شعار مومنین کو دئے جائیں گے یا سرکش ونافرمان مسلمانوں کے بھی اعمالنامے داہنے ہاتھ میں ہوں گے؟ علماء نے لکھا ہے کہ عاصی اور گنہگار مسلمانوں کے اعمالنامے بھی ان کے داہنے ہاتھ میں ہی ہوں گے لیکن ان کی بداعمالیوں پر توبیخ وتہدید اور جہنم کی سزا سے فارغ ہونے کے بعد یہ معاملہ ان کے ساتھ کیا جائے گا اور بعض کہتے ہیں کہ اعمال نامے شروع ہی

سے ان کے داہنے ہاتھ میں دے دیے جائیں گے لیکن ان کو پڑھنے کا حکم، سزا اور جہنم سے نکلنے کے بعد ہوگا اور کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عاصیوں کو ان کے اعمالنامے نہ داہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور نہ بائیں ہاتھ میں بلکہ چہرے کی جانب سے پیش کیے جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اعمالنامے کسی طرح بھی نہ دیے جائیں۔ صرف ان کے اعمال واحوال خود ہی پڑھ کر سنا دیے جائیں۔ لیکن:

ہماری رائے یہ ہے کہ گنہگار مسلمانوں کے بارے میں یہ اختلافات صرف علماء کی قیل وقال ہے ورنہ حقیقتاً قرآن میں کوئی صراحت اس سلسلہ میں نہیں ملتی۔ (اس لئے بہتر ہے کہ اس کا علم خدا ہی کے سپرد کیا جائے) بہر حال اس تفصیل سے اتنا تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ اعمالناموں سے مقصود دراصل اعمال کا حساب وکتاب ہے لہٰذا جب کتاب ہائے اعمال حق ہے تو حساب اعمال کے بھی حق ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

سوال وجواب: ہاں اس روز خداوند تعالٰی انسانوں سے ضرور دریافت فرمائیں گے کہ دنیاوی زندگی میں تم نے کیا کیا، طاعت ومعصیت میں سے کس کو تم نے اختیار کیا تھا؟ اس قسم کے سوالات فرشتوں سے بھی کیے جائیں گے۔ احادیث میں ہے کہ سب سے پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ آپ نے وحی کس طرح انبیاء تک پہنچائی؟ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ''لوحِ محفوظ'' سے سوال ہوگا۔ اس کو خدا کے سامنے حاضر کیا جائے گا تو وہ خدا کی ہیبت وجلال سے کانپ رہی ہوگی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ علوم جبرئیل تک تم نے منتقل کیے۔ اس پر کون گواہ ہے؟ اس پر وہ کہے گی کہ میرے گواہ حضرت اسرافیل ہیں، اسرافیل حاضر کیے جائیں گے اور اس وقت خدا کی کبریائی وعظمت سے ہر ایک پر دہشت طاری ہوگی، اس کے بعد انبیاء کھڑے کیے جائیں گے اور ان سے وحی کی تبلیغ، رسالت کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں سوالات ہوں گے۔ عبادات میں سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال ہوگا اور معاملات میں ناحق خونریزی کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی، ظالم کے حسن اعمال، مظلوم کو دے دیے جائیں گے اور مظلوم کی بداعمالیاں ظالم کے اعمال میں شمار ہوں گی۔

روایات میں ہے کہ سات سو نمازیں، ایک حقیر رقم کے عوض میں جاتی رہیں گی (یعنی اگر کسی شخص نے سات سو مقبول نمازیں پڑھی ہوں گی لیکن اس پر کسی کی معمولی رقم نکلتی ہوگی اور اس نے ادا نہ کیا ہوگا تو یہ سات سو مقبول نمازیں اس شخص کو دے دی جائیں گے جس کا مطالبہ تھا) اور روایات میں یہ بھی ہے کہ فرض کرو کسی شخص کے پاس حسن اعمال کے نتیجہ میں سات سو پیغمبروں کے برابر بھی ثواب ہوگا تو یہ شخص ہرگز جنت میں نہیں جا سکتا تاوقتیکہ مظلوم اس سے راضی نہ ہو جائے۔

افسوس کہ ایسا خوفناک وحشت انگیز دن درپیش ہے اور ہم پڑے سوتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے سمجھا وہی ٹھیک ہے، اور جو اچھے اعمال ہم نے کئے دوسروں کا دفتر ان سے خالی ہے۔ عوام پر غفلت، علماء مصروف قیل وقال، صوفیاء خودی میں گم، اس وقت اور اس دن کی کسی کو بھی خبر نہیں، سب افسانہ خوانی میں لگے ہوئے ہیں اور ہر ایک بخیال خویش جطلے دا کی تصویر بنا ہوا ہے۔ نہ موت کا تصور اور نہ احوال آخرت کی فکر۔

فاناللہ و انا الیہ راجعون.

شانِ رحمت: بہر حال اب جبکہ بندہ حقوق العباد کی زد میں آ کر بڑی طرح مبتلائے فکر و آلام ہوگا، تو خدائے ذوالجلال کی رحمت جوش میں آئے گی اور مظلوم کی جنت کے بعض خوشگوار مناظر دکھا کر خود ہی دریافت فرمائیں گے کہ اس حسین و دیدہ زیب جگہ کو کون خریدنا چاہتا ہے؟ اس پر وہ کہے گا! کہ اے میرے پروردگار کس کی ہمت ہے کہ اس کو خرید سکے، فرمائیں گے کہ تم خرید سکتے ہو، اس کی قیمت تمہارے پاس ہے، دو اور لو، بندہ عرض کرے گا کہ وہ قیمت کیا ہے؟ ارشاد ہوگا کہ اپنے اس مسلمان بھائی پر جو تمہارا مطالبہ ہے اس کو معاف کر دو اور اس کو بری الذمہ قرار دے دو تو یہ بہشت تم کو مل جاتی ہے۔ بندہ یہ سن کر بہزار مسرت و شادمانی اپنے بھائی کو معاف کر دے گا اور نہ صرف معاف بلکہ دل سے خوش ہو جائے گا۔ خدائے ذوالمنن اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے اور اس کو فردوس بریں میں بھیج دیا جائے گا۔

کتب احادیث میں بعض اس مضمون کی بھی احادیث ملتی ہیں کہ اس سوال و جواب

کے وقت بعض مومن بندوں کو اللہ تعالیٰ اپنے بہت قریب بلائیں گے اور اس رازداری کے ساتھ گفتگو کریں گے کہ تیسرا شخص سن نہ سکے گا، فرمائیں گے کہ دیکھو جس طرح دنیا میں میں نے تمہارے گناہوں اور بداعمالیوں کی پردہ داری کی آج بھی تمہاری بدعملیوں پر، پردہ ڈالتا ہوں یہ کہہ کر حسنات کا دفتر اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا لیکن کافروں اور منافقوں کو خوب رسوا کیا جائے گا۔ عین اس وقت ایک آواز لگانے والا بآواز بلند کہے گا کہ ہاں سن لو خدا کی لعنت صرف ظالمین پر ہی ہے۔

بات بس یہ ہے کہ وہاں سب کچھ کام انہیں کے فضل و کرم پر ہوں گے (اور اس پر بڑا اطمینان ہے) لیکن ان کے عدل و انصاف سے جان کانپتی ہے۔ سعدی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

اگر در دہد یک صلائے کرم — عزازیل گوید نصیبے برم

اور اس کے ساتھ یہ بھی پڑھیے۔

بہ تہدید گر برکشد تیغ حکم — بمانند کروبیاں صم بکم

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

"خدا کے بندوں کو اس دن نہ خوف ہوگا نہ رنج و ملال"

اور دوسرے موقع پر ارشاد ہے کہ

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون

"اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ کیا ہے ہاں ان سب سے ضرور وہی دریافت کرے گا۔"

ان معاملات میں سوائے حیرت اور بے چارگی کے کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔ ہمیں تو دونوں باتوں پر ایمان لانا چاہئے اور یقین رکھنا چاہئے کہ احکم الحاکمین صرف وہی ہے۔ واللہ علی کل شئی قدیر۔

کوثر: جناب رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے روز ایک حوض عطا فرمائی جائے گی اس

کا نام ''حوض کوثر'' ہوگا۔قرآن مجید میں ''انا اعطینٰک الکوثر'' کی تفسیر اسی حوض کوثر، کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس حوض کی وسعت ایک ماہ کی مسافت کے برابر ہوگی (یعنی اس قدر لمبی اور وسیع ہوگی کہ اگر کوئی شخص ایک ماہ مسلسل پیادہ چلتا رہے تو تب جا کر اس کو ختم کرسکتا ہے اوراس کے آخری کنارے پر پہنچ سکتا ہے) اس کا پانی دودھ سے بھی زیادہ سفید ہوگا اور خوشبو مشک سے بھی بڑھ کر روح افزا ہوگی، کوزے جن سے پانی پیا جائے گا ستاروں سے زیادہ چمکدار اور بڑے ہوں گے۔ یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ پانی پئے گا تو پھر عمر بھر اس کو پیاس محسوس نہ ہوگی۔ حوض کی وسعت اور لمبائی کو بیان کرنے کیلئے احادیث میں مختلف جگہوں کا ذکر ملتا ہے، یہ اختلاف بیان غالباً دریافت کرنے والوں کی وجہ سے ہے، چنانچہ یمن والوں نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کوثر کس قدر لمبی ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا کہ صنعاء سے لے کر عدن تک کی مسافت، اس کی لمبائی کے برابر ہوگی۔ اہل شام نے ایک مرتبہ اسی قسم کا سوال کیا تو آپ نے دوسرا ہی جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک سائل کے نزدیک جو مسافت متعارف معلوم تھی، آپ اس کے مطابق جواب دیتے۔

اسی طرح بعض احادیث میں زمانے سے بھی اس کی لمبائی کا بیان ملتا ہے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ ''اس قدر لمبی ہوگی کہ آدمی اس کے کنارے پر ایک ماہ مسلسل چلتا رہے تو دوسرے کنارے تک پہنچے'' غرضیکہ ان مختلف تعبیرات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کا مقصد صرف حوض کی وسعت وعظمت کو بیان کرنا ہے لوگوں کے علم ومعلومات کے مطابق آپ مختلف پیرائیہ بیان تلاش کر لیتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر نبی کو اس کے مقام ومرتبہ کے موافق حوض دی جائے گی۔ غالباً اسی وجہ سے علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ کو دو حوض عنایت کی جائیں گی (کیوں کہ آپ افضل الانبیاء ہیں) ان دونوں حوضوں کا نام کوثر ہی ہوگا۔

ساقی کوثر: احادیث میں ہے کہ حوض کوثر پر پلانے کا کام (ساقی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ انجام دیں گے۔ اس دنیا میں جو آج ان کی محبت میں مست و بے خود اور ان کی

ملاقات کا آرزومند نہ ہو مشکل ہے کہ اس کو کوثر کے جرعے، عنایت کئے جائیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ ''جس کے قلب میں ابوبکر صدیق کی محبت نہ ہوگی اس کو ایک بھی قطرہ نہ دوں گا۔ بہرحال کوثر پر ان تمام تفصیلات کے ساتھ عقیدہ وایمان رکھنا چاہئے۔

پل صراط: قیامت کے دن دوزخ کی پشت پر اللہ تعالیٰ ایک پل قائم کریں گے۔ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے بڑھ کر تیز ہوگا۔ پھر تمام مخلوق سے کہا جائے گا کہ اس پر چلو، بہشتی اس پر سے گزر کر سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ بعض کوندنے والی بجلی کی طرح نکل جائیں گے، بعض صبا رفتار ہوں گے اور کچھ تیز رو گھوڑے کی طرح آناً فاناً میں ادھر سے ادھر ہو جائیں گے۔ اس پل پر ہر ایک کا گزرنا بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح دنیا میں وہ صراط مستقیم پر قائم رہا (یعنی اگر کسی کا دنیا میں صراطِ مستقیم (دین) پر قدم راسخ رہا تو وہ آج اس پل پر سے بہت ہی تیزی سے گزر جائے گا، اور جن کے قدم دنیا کی صراطِ مستقیم پر متزلزل رہے یہاں بھی آج ان کے قدم لڑکھڑائیں گے) کیوں کہ یہ پل صراط دنیا ہی کی صراط کا ایک نمونہ ہے اور دوزخی لڑکھڑا کر جہنم میں جا پڑیں گے۔ قرآن حکیم کی اس آیت کہ ''ان منکم الاوار دھا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ پل صراط پر سے سب ہی کو گزرنا پڑے گا۔ تا آنکہ جناب رسول اللہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہوں گے۔ بعض ارباب ذوق نے کہا ہے کہ آنحضورﷺ کی اس پر پل گزارنے کی حکمت یہ ہے کہ بعض وہ مسلمان جہنمی جو کہ اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں کچھ وقت جہنم میں گزار کر آئیں، آج آنحضورﷺ کے جمال جہاں آراء سے جدائی کے ایام اور فراق کی گھڑیوں کے غم و اندوہ کی تلافی کرلیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضورﷺ کو پل صراط پر گزرنے کی زحمت نہ دی جائے گی بلکہ آپؐ جناب باری عز اسمہ کے حضور میں کھڑے ہوں گے اور گزرنے والے آپ کے سامنے سے نکل کر جائیں گے ہمارا بھی خیال یہی ہے کہ آنحضورﷺ پل صراط پر سے نہیں گزریں گے۔ اگر آپؐ پل صراط پر سے گزرے تو یقیناً آتش جہنم، گلستاں ہو کر رہ جائے گی۔ سوچنے کی

بات ہے کہ جب جہنم مومن تک سے کہے گی کہ (اے مومن جلد گزر تیرے نور ایمان نے تو میرے شعلوں کی لپٹوں کو ٹھنڈا کر دیا) تو وہ سرور کائنات جو منبع انوار ایمانی اور سرچشمہ تجلیات نورانی ہیں بھلا ان کے مقابل میں آتشکدۂ جہنم کی کیا تاب کہ اپنی لپٹوں کے ساتھ زندہ رہ جائے۔ جو نور خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ناصیہ میں ودیعت تھا اس نے آتشِ نمرود کو گلستاں کر دیا۔ تو پھر اسی نور کامل سے جہنم کا سرد ہو جانا ممکن نہیں؟

شفاعت نبویؐ: یہ بھی عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جن رسولوں انبیاء، اولیاء، علماء، ملائکہ، جنات کو اللہ کی جناب میں کچھ عرض کرنے کی اجازت ہوگی وہ گنہگاروں کی اللہ تعالیٰ سے ضرور سفارش کریں گے۔ اس شفاعت کے دروازے کو سب سے پہلے آنحضور ﷺ کھولیں گے اور آنے والی کل میں، معلوم ہوگا کہ آپ کو اللہ کی جناب میں کیا مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ وہ دن آپ ہی کا ہوگا اور مقام ومنزلت صرف آپ کی ہوگی۔ اللھم بحق جاہ محمد اغفرلنا! جب تمام دنیا اس مقام کی ہولناکیوں سے، جاں بلب ہو رہی ہوگی تو سب دوڑ کر شفاعت کیلئے آپ ہی کے پاس آئیں گے۔ آپؐ ہی ان کی تکلیف کا علاج اور ان کا درد کا مداوا فرمائیں گے۔

احادیث میں ہے کہ سب سے پہلے تمام کے تمام حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پہنچ کر کہیں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں، خدا نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، بہشت بریں میں جگہ دی، تمام اسماء کی حقیقتیں اور اشیاء کے خواص سکھلائے۔ ان تمام امتیازات اور خصوصیتوں کی بناء پر آپ ہی شفاعت کے مستحق ہیں۔ اس لئے آج کے ہنگامہ خیز دن میں آپ ہماری شفاعت کیجئے۔ آدم علیہ السلام کہیں گے کہ آج کے ہنگاموں کا مقابلہ کرنا اور شفاعت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ خدا کے منع کرنے کے باوجود جو شجرہ میں نے کھا لیا تھا اس جرم کی شرم وندامت سے آج تک محجوب وشرمسار ہوں۔ شاید یہ کام نوحؑ انجام دے سکیں۔ یہ تمام دوڑ کر نوح کے پاس آئیں گے تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں بھیج دیں گے اور ابراہیم، موسیٰ کی، موسیٰ جناب عیسیٰؑ کی، غرضیکہ یہ تمام الوالعزم انبیاء اپنی لغزشوں کے تصور سے محجوب وشرمندہ ہوں

گے۔ کسی کو بھی دہشت وہیبت میں شفاعت کی جرات نہ ہو سکے گی۔ آخر کار جناب رسول اللہ ﷺ سے جو کہ شافع روزِ محشر ہیں اور جن کا اکرام واعزاز "لیغفر لک اللّٰہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر" سے ظاہر ہے، اپنا عرضِ حال کریں گے۔ اس پر وہ رحمۃ للعالمین سراپردہ عزت وجلال میں حاضر ہوں گے اور مقام محمود پر جس کا وعدہ دنیا میں عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً کہہ کر کیا گیا تھا کھڑے ہوں گے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر آپ کے علاوہ کوئی اور کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ سجدے میں چلے جائیں گے اس پر کہا جائے گا کہ "سر اٹھایئے جو چاہتے ہیں کہیے جو کچھ کہنا ہو کہیے۔ اس پر جناب رسول اللہ ﷺ سجدے سے سر اٹھائیں گے اور خاص اس زبان میں جو اس وقت آپ کو سکھائی جائے گی خدا کی حمد وثناء فرمائیں گے اور گنہ گاروں کی ایک جماعت کو بخشوا لیں گے۔ پھر سجدے میں جائیں گے اور گنہ گاروں کی ایک جماعت کو بخشوائیں گے۔ تیسری بار پھر سجدہ کریں گے اور اس مرتبہ گنہ گاروں میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہے گا جس کی مغفرت ونجات نہ ہو۔ ہاں! صرف وہ ضرور رہ جائیں گے جن کا فیصلہ دائمی طور پر جہنم میں رہنے کا کیا جا چکا ہے یعنی کافر اور منافق۔

یہاں تک ہے جو کچھ بیان کیا یہ ایک صحیح حدیث کا مضمون ہے جو کہ بخاری ومسلم میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی شفاعت آنحضور ﷺ ہی فرمائیں گے اور کسی دوسرے کی شفاعت کی ضرورت باقی نہ رہے گی لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کی شفاعت صرف اپنی امت کیلئے ہوگی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انبیاء آپؐ سے درخواست کریں گے اور آپ جناب باری عز اسمہ میں ان کی امتوں کیلئے عرض ومعروض کریں گے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

ایک دوسری حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ سب ہی کی شفاعت فرمائیں گے۔ مگر وہ لوگ جن کے دامن میں سوائے لا الٰہ الا اللہ کے اور کچھ نہیں اور جن کی زندگی بد اعمالیوں سے پوری طرح داغدار ہے ان کے حق میں آپ کی شفاعت نہ ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ان کیلئے بھی شفاعت کریں گے لیکن ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ:

"اے محمد ان کو میرے لئے چھوڑ دو، میں ان کی شفاعت خود اپنے سے کروں گا اور جہنم سے ان کو نکال لوں گا۔"

بہرحال آج کے دن آپ کی پوری پوری رعایت کی جائے گی۔ آپ کا بلند مقام سب پر ظاہر ہوگا۔ آپ کی قدر و منزلت ہوگی آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔ درحقیقت آپ ہی وہاں مہمان ہوں گے۔ بقیہ تو سب آپ کے طفیلی ہوں گے۔ قرآن مجید میں ہے:

ولسوف یعطیک ربک فترضی

یعنی اے محمد اے محب، اے محبوب، اے میرے مطلوب، اے میرے خاص بندے آج تجھ پر وہ نعمتیں ہوں گی، وہ رحمتوں کی بارش ہوگی کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے گا اور تیرے دل میں کوئی تمنا باقی نہ رہے گی۔ سب تیری رضا چاہتے ہیں اور میں تیری خوشنودی مزاج کا طالب، اس پر آپؐ (نازش محبوبانہ کے ساتھ فرمائیں گے) میں تو راضی نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ آپ میری امت کے ایک ایک فرد کو نہ بخش دیں۔ کہتے ہیں کہ آیت کریمہ

لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعاً

آپ کی امت کے ساتھ خاص ہے۔ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

یغفرلکم من ذنوبکم

نحوی قاعدہ کے مطابق حرف من، تبعیض کا فائدہ دے گا۔ یعنی تمام گناہ معاف کرنے کا وعدہ نہیں، بعض گناہ معاف کرنے کی بشارت ہے۔

بس بات یہ ہے کہ آپؐ کی امت کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ ہوگا اور بقیہ امتوں کے باب میں عدل و انصاف کارفرما ہوگا۔ یہ امید یہ بشارت، گنہگاروں کیلئے سرمایہ اطمینان ہے جب مہمان عزیز ہے تو اس کے طفیلی بھی بہرحال عزیز ہوں گے۔

بلہ تو مید بناشی گرت آں یار براند — گرت امروز براند نکہ فردات نخواند

بس اے لوگو! ان کی امت میں داخل ہو جاؤ خود کو ان کے سپرد کر دو پھر سب آسان ہے، مشکل تو سب سے بڑی یہ ہے کہ ان سے نسبت درست نہ ہو، اگر تعلق ٹھیک ہے تو پھر کیا فکر، لاکھوں گناہ، ان پر اگر ایمان ہے تو پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، اگر ایمان کا نور مومن کے دل میں ہے تو معصیت کی تاریکی آ ہی نہیں سکتی۔ بس ایمان کی فکر کرو، پھر فکر کسی بات کا نہیں۔ سفیان ثوریؒ کو لوگوں نے دیکھا کہ ساری رات تڑپتے رہے کسی پہلو چین نہ آیا، لوگوں نے کہا کہ یہ بے قراری کیوں ہے؟ خدا کا شکر کیجئے کہ گناہوں سے آپ کا دامن داغدار نہیں۔ سفیان بولے کہ گناہوں کا کیا غم، اگر پہاڑ برابر بھی گناہ ہوں تو خدا کی رحمت کے سامنے کاہ کے برابر بھی نہیں، فکر تو یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ بھی جاتے ہیں یا نہیں۔

ایمان چو سلامت بلب گور بریم ؎ احسنت زہے چستی و چالاکی ما

(قلم ذوق وشوق میں کہاں سے کہاں نکلا) حالانکہ شفاعت کے سلسلہ میں کچھ اور باتیں کہنا رہ گئی ہیں کہنا یہ ہے کہ شفاعت کے بہت سے مواقع ہیں سب سے پہلے اس مقام پر شفاعت ہوگی جہاں مخلوق حساب وکتاب سے پہلے کھڑی ہوگی۔ اس وقت کے پر آشوب اور ہولناک حالات کے تحمل کی اس میں تاب وطاقت نہ ہوگی۔ دوسرا شفاعت کا موقع، حساب میں سہولت اور زیادہ پوچھ گچھ سے محفوظ رہنے کی درخواست کے وقت ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ "جس سے بھی پوچھ گچھ شروع ہوگی وہ ہلاک ہوا۔ تیسرا شفاعت کا موقع وہاں ہوگا جب کسی کیلئے عذاب کے حکم کا منسوخ کرانا منظور ہوگا۔ چوتھا شفاعت کا موقع وہ بھی ہوگا جب جہنم کے درکات سے گلو خلاصی کی ضرورت ہوگی۔ پھر پانچویں شفاعت درجات کی بلندیوں اور حصول ثواب کیلئے بھی ہوگی۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ کسی مجرم کو بادشاہ کے سامنے لیجا کر کھڑا کریں تو بادشاہ کے خاص لوگوں میں سے کوئی کھڑا ہو کر اس کی شفاعت کرے اور اس شفاعت پر اس مجرم کو بیٹھ جانے کی اجازت دے دی جائے اور پھر اس سے بات چیت، تحقیق وتفتیش شروع ہو، پھر وہ شاہی مقرب کھڑا ہو کر سفارش کرتے ہوئے عرض پیرا ہو کہ حضور اس مجرم سے پوچھ تاچھ نہ ہو، اگر ہو تو

نہایت سرسری طور پر۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جرم ثابت ہونے پر جیل خانے بھیجنے کا حکم تک کر دیا جاتا ہے لیکن کسی کی سفارش پر یہ حکم منسوخ کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ''قید خانہ'' میں رکھ کر کچھ سزا دینے کے بعد پھر نکالتے ہیں اور منصب بلند عطا کیا جاتا ہے۔ (بہرحال جس طرح دنیا میں سفارش کے یہ عام قاعدے اور دستور ہیں اسی طرح وہاں بھی شفاعت ہوگی) اس لئے تمام مسلمانوں کو آنحضور ﷺ کی شفاعت سے امید رکھنا چاہئے۔ انشاء اللہ آپ کی شفاعت پر قرب اور بہشت بریں کے اعلیٰ مراتب مسلمانوں کو حاصل ہوں گے۔

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو — کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

آنحضور ﷺ کی شفاعت عام بھی ہوگی اور خاص بھی۔ آپ کی عام شفاعت تو تمام امت بلکہ تمام مخلوق کیلئے ہوگی اور خاص شفاعت کہ اہل مدینہ اور آپ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے والے یا آپ پر کثرت سے درود بھیجنے والوں کیلئے ہوگی۔

شفاعت کی حقیقت: محققین کہتے ہیں کہ شفاعت سے مراد اصل رحمت الٰہی کی وہ شعاعیں ہیں جو آنحضور ﷺ کے قلب مبارک پر بارگاہ قرب وعزت سے پڑتی ہیں اور پھر وہ ''قلوب صافی'' جو آپ کے قلب اطہر سے تعلق رکھتے ہیں ان کے ساتھ ان شعاعوں کا معاملہ ایسا ہے جس طرح ایک جگہ پانی ہو اور اس کے کنارے پر کوئی دیوار ہو، آفتاب کی کرنیں اس پانی پر پڑ رہی ہوں، اور احدیت سے رحمت کی شعاعیں اول اور بلاواسطہ آنحضور ﷺ کے قلب صافی پر پڑتی ہیں اور پھر آپ ﷺ کے واسطہ سے دوسرے قلوب پر پرتو فگن ہوتی ہیں اور قلوب کا آپؐ کے قلب اطہر سے فیض یاب ہونا، اتباع سنت پر موقوف ہے جو جس قدر سنت پر مداومت رکھے گا اتنا ہی اس کے قلب کو آپ کے قلب کے ساتھ مناسبت اور گہرا تعلق ہوگا۔ ان پاک باطن لوگوں کی شفاعت، رفع درجات کیلئے مفید ہوگی۔ ورنہ تو صرف گناہوں کی مغفرت کے سلسلہ میں آپ کے ساتھ نفس ایمان میں بھی شریک ہونا کافی ہے۔ آنحضور ﷺ سے گہرا روحانی ربط پیدا کرنے کیلئے آپ پر مسلسل درود وصلوٰۃ کا بھیجنا بہت مفید ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم لیلاً ونہاراً ظاھراً وباطناً کلما ذکرہ الذاکرون وکلما غفل عن ذکرہ الغافلون باللہ التوفیق۔

حواشی

۱ بخاری شریف جلد ثانی میں حدیث ابوہریرہ کا آخری ٹکڑا ہے کہ "یبلی کل شئی من الانسان الا عجب ذنبہ فیہ یرکب الخلق" ابن ماجہ میں اسی حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ: "قال رسول اللہ ﷺ لیس شئی من الانسان الا یبلی الا عظم واحد وھو عجب الذنب و منہ یرکب الخلق یوم القیامۃ" آنحضورﷺ کا ارشاد ہے کہ انسان کے تمام اعضاء ختم ہو جائیں گے۔ سوائے "عجب الذنب" کے کہ قیامت کے روز اسی سے مخلوق کو تیار کیا جائے گا۔

عجب الذنب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں، ظاہر حدیث کے پیش نظر علماء امت کی یہی رائے ہے کہ یہ ہڈی انسانی اعضاء میں سے محفوظ رہے گی۔ مزنی اور ابن عقیل اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ابن عقیل کہتے ہیں کہ عجب الذنب کا معاملہ بالکل عجیب ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور کیا ہوگا؟)

۲ ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۶۱ھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امت مرحومہ کی دوسری شخصیت جن کے مجموعہ حدیث کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ بعض وجوہ سے ان کی مسلم بخاری پر فائق ہے، ان کی وفات کے بعد ابوحاتم رازی نے خواب میں دیکھا۔ حال پوچھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں پھرتا ہوں، فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

۳ ابوداؤد اور ترمذی کی روایات سے صور کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سینگ کے ہم شکل کوئی چیز ہے جس میں پھونک ماری جائے گی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ صور کی سب سے پہلی آواز ایک اونٹ والا سنے گا، جو اپنے حوض کو تیار کر رہا ہوگا، یہ ہولناک آواز اس کے کان میں پڑے گی، سنتے ہی بے ہوش ہو جائے گا اور اس کے بعد پھر سب بے ہوش ہو جائیں گے۔

۴ اصطلاح علماء میں پہلی مرتبہ صور پھونکنے کا نام نفخہ اولیٰ ہے اور اسی کو نفخہ اماتت بھی کہتے ہیں (اماتت کے معنی مارنے کے ہیں چونکہ اس نفخہ پر سب جاندار مر جائیں گے اس لئے اس کو نفخہ اماتت کہا گیا) اور دوسری صور پھونکنے کا نام نفخہ ثانیہ ہے اس کو نفخۂ احیاء بھی کہا جاتا ہے (احیاء یعنی زندہ کرنا کیوں کہ اس نفخہ پر مر کر بھی سب زندہ ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ نفخۂ احیاء کے نام کے ساتھ موسوم ہوا)۔

۵ حدیث بطاقہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے روز

آنحضور ﷺ کی امت میں سے ایک شخص کو مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا اور پھر ننانوے نامہائے اعمال جو حد نظر تک وسیع ہوں گے اس کے سامنے پھیلا دیے جائیں گے۔ خداوند تعالیٰ دریافت فرمائیں گے کہ یہ تمام اعمال سیئہ جو تیری طرف منسوب کئے جارہے ہیں کیا تو ان کا انکار کرتا ہے؟ تو وہ شخص کہے گا کہ نہیں اس کے بعد اس سے پوچھیں گے کہ ان بدعملیوں کے مقابلہ میں کیا کچھ اچھے اعمال بھی ہیں؟ وہ بیچارہ گھبرا کر کہے گا کہ نہیں اس پر خداوند تعالیٰ فرمائیں گے نہیں تیرے کچھ اچھے اعمال ہمارے پاس موجود ہیں اور آج تجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ اس کے بعد کاغذ کا ایک پرزہ نکالا جائے گا جس پر کلمہ شہادت لکھا ہوا ہوگا یہ شخص اس پرزہ کو دیکھ کر بولے گا اے خدا ان لمبے چوڑے نامہائے اعمال کے مقابلہ میں اس پرزے کی کیا حقیقت ہے؟ فرمائیں گے کہ ہاں تجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی یہ کہہ کر کاغذ کا وہی پرزہ ایک پلہ میں رکھ دیا جائے گا تو بد اعمالیوں والا پلہ ہلکا ہو کر اوپر اٹھ جائے گا اور بطاقہ والا پلہ بوجھل ہو کر نیچے بیٹھ جائے گا اس حدیث میں بطاقہ (پرزہ) کا لفظ آیا ہے اس لئے علماء دین کے یہاں یہ حدیث بطاقہ کے نام سے مشہور ہے۔

۲ عالم آخرت کے بہت سے معاملات بلکہ تقریباً سب ہی اس دنیا کے معاملات سے یکسر بدلے ہوئے ہوں گے۔ مثلاً آفتاب کے طلوع و غروب کے جو اوقات، علامات قیامت کے سلسلہ میں احادیث میں بیان کئے گئے ہیں ہمارے اس نظام شمسی سے کس درجہ مختلف ہیں۔ اس لئے میزان عدل کے متعلق جو کچھ بتایا گیا اس پر کوئی حیرت و استعجاب صحیح نہ ہوگا۔

۳ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میری حوض کی مسافت ایلہ اور عدن تک کی مسافت سے زیادہ ہے ایلہ شام میں ایک جگہ کا نام ہے اور عدن جنوب میں ایک شہر ہے، دونوں میں کئی منزل کا فاصلہ ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اسلام اختیار کر کے پھر اس کو چھوڑنے والے اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب کے اختیار کرنے والے کو کوثر سے اس طرح ہٹا دوں گا جس طرح کوئی اپنے تالاب سے غیر کے اونٹوں کو ہانک دیتا ہے۔ بعض علماء نے اہل شیعہ، خوارج و معتزلہ کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے دریافت کیا کہ اس روز آپ ہم کو کس طرح پہچانیں گے؟ جواب میں فرمایا کہ تمہارے وہ اعضاء جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں اس روز خوب روشن ہوں گے۔ انہیں اعضاء کی روشنی میں میں تم کو پہچان لوں گا۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، پیاسے ہوں گے، ہر نبی اپنی امت کے نیکوں کو اپنے حوض سے پانی پلائے گا۔ یہ پانی کب پلایا جائے گا؟ آیا حساب و کتاب سے پہلے یا بعد میں، پل صراط سے گزرنے پر یا اس سے قبل، اس میں اختلاف ہے واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن میں کوثر سے حوض کوثر مراد نہیں بلکہ خیر کثیر مراد ہے۔ اگر ایسا ہے تو حوض کوثر کا ثبوت احادیث سے ہوگا اور اس کی مسافت کیفیات وغیرہ سب احادیث سے ہی ثابت ہوں گی۔ بہرحال حوض کوثر پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ قرآن سے اس کا ثبوت نہ مل سکا اس پر ایمان نہ لانے کیلئے کوئی قوی وجہ نہیں بن سکتی۔

۸ ابو العباس احمد بن عمر القرطبیؒ مالکی مذہب کے پابند تھے، قرآن کی تفسیر بھی فقہ مالکی کے مطابق لکھی ہے۔ ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور ذیقعدہ ۶۵۶ھ میں وفات پائی۔

۹ ابو عبد اللہ سفیان بن سعید ثوریؒ علم حدیث و فقہ کے امام اور تصوف و تزکیہ کے ترجمان تھے۔ سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں ۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ابو صالح شعیب بن حرب مدائنی کہتے تھے کہ شاید قیامت کے روز سفیان مخلوق کے سامنے پیش کئے جائیں اور خدا ہر ایک سے دریافت کرے کہ اگر تم نے اپنے نبی کو نہیں دیکھا تھا تو سفیان کو تو ضرور دیکھا تھا پھر ان کی اقتداء کیوں نہ کی اس طرح سفیان کی جلالت قدر کا سب نے اعتراف کیا ہے بصرہ میں ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

۱۰ اس طرح شفاعت کی کل پانچ صورتیں احادیث سے مفہوم ہوتی ہیں، ان سب پر عقیدہ رکھنا چاہئے۔ معتزلہ شفاعت کی پہلی اور پانچویں قسم کے قائل ہیں اور شفاعت کی بقیہ تمام صورتوں کا انکار کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہی نہیں رہتا اور کسی غیر مومن کیلئے شفاعت مغفرت نہیں ہوسکتی، ان کا یہ خیال قطعاً غلط ہے، ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ روایت کی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے گناہ کبیرہ کرنے والے کیلئے بھی میری شفاعت ہوگی یا بخاری امت میں سے گناہ کبیرہ کرنے والے کیلئے بھی میری شفاعت ہوگی یا بخاری شریف میں موجود ہے کہ جو شخص ''من قال لا الٰہ الا اللہ'' کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا، ان احادیث کے پیش نظر معتزلہ کی اپج یقیناً ناقابل قبول ہے۔

۱۱ وہ شخص جس نے مدینہ میں ثواب سمجھ کر قیام کیا اور اس کی وہاں موت ہوگئی ہو۔ آنحضور ﷺ نے اس کیلئے خاص طور پر شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ ''من زار قبری وجبت لہ شفاعتی'' یعنی جس نے میری قبر کی زیارت کی ہے اس کی بھی شفاعت مجھ پر واجب ہے۔

جنت وجہنم

آیات واحادیث میں جس تفصیل کے ساتھ جنت اور جہنم کا ذکر آیا ہے اس پر اسی تفصیل کے ساتھ عقیدہ رکھنا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ جنت اور جہنم کہاں ہیں؟ تو اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جنت آسمان پر ہے یا آسمانِ چہارم پر یا پھر ساتویں آسمانوں سے بھی اوپر ہے۔ اسی طرح جہنم کے متعلق بعض تو کہتے ہیں کہ وہ آسمان پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ زمین کے نیچے ہے علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جنت وجہنم کے مقام کی تعیین کا علم خدا کے سپرد کرنا چاہئے۔ کیونکہ کوئی تحقیقی بات اس سلسلہ میں نہیں کہی جاسکتی ہے اور شرح مقاصد کی تصریحات یہ ہیں کہ اگرچہ ان دونوں کے مقام کی تعیین کے سلسلہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں ہے تاہم اکثر علماء اور محققین کی رائے یہ ہے کہ جنت آسمان پر عرشِ بریں کے نیچے ہے اور جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے:

وجنۃ عرضھا السمٰوات والارض.

اس آیت کے پیش نظر زمین وآسمان کے کسی متعین مقام پر جنت کے ہونے کی صورت کیا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ قرآن کی اس تصریح کے مطابق اس قدر طویل وعریض عرصہ کسی ایک جنتی یا ایک ہی جنت کیلئے درکار ہے۔ بعض مفسرین نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ جنت کا اس قدر طویل وعریض ہونا اس وقت پر ہے جبکہ زمین وآسمان دونوں کو باہم خلط ملط سمجھا جائے (ورنہ اگر زمین وآسمان علیحدہ علیحدہ فرض کئے جائیں تو جنت کے یہ وسیع طول وعرض سمجھ میں نہ آئیں گے) اور اس ذہنی اشکال کا معقول جواب تو یہ ہے کہ انسانوں کی نظر میں زمین وآسمان سے بڑھ کر طویل و

عریض چیز کوئی ہے ہی نہیں، اس لئے جنت کی وسعت کو سمجھانے کیلئے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ گویا جنت کی وسعت کو بطور مبالغہ سمجھانے کیلئے اس انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی اس قدر طویل وعریض ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ جنت کی وسعتوں کے متعلق صحیح علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہے جبکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کا چھوٹے سے چھوٹے مکان دنیا بلکہ اس دنیا سے دس گنا بڑا ہوگا۔ تو اب کون کہہ سکتا ہے کہ بہشت کا طول وعرض وسعت انتہائی کیا ہے؟

اعراف: ایک ایسے مقام کا تصور جو بہشت اور جہنم کے درمیان ہو، اور نفاست پاکیزگی میں نہ بہشت کے مانند ہو اور نہ گوناگوں عذاب ومحن میں دوزخ کی نظیر ہو، کسی نص قطعی سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں بعض سلف سے منقول ہے کہ اعراف مشرکین کی اولاد اور اس زمانہ کی موحدین کیلئے جن کے دور میں کوئی نبی نہ آیا ہو، بنایا گیا ہے لیکن امام سبکی کہتے ہیں کہ حدیث میں اعراف[۱] کا اس طرح ذکر کہ کسی مستند عالم نے اس کو اختیار کیا ہو، کم از کم میرے علم میں نہیں ہے اور قرآن کی یہ آیات کہ "علی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیمٰھم" سے اعراف کا ثبوت مشکل ہے کیونکہ یہاں اعراف سے مراد ایک لمبی دیوار ہے جو بہشت ودوزخ کے درمیان ہوگی اور اس پر انبیاء، ملائکہ، شہداء، مومنین، علماء یا فرشتے، انسانی شکل وصورت میں موجود ہوں گے جو جنتیوں اور دوزخیوں کو پہچانیں گے اور ان سے گفتگو کریں گے۔

---

۱ اعراف، عرف کی جمع ہے جس کے معنی بلند جگہ کے آتے ہیں اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک بلند حجاب ہے جو کہ عالم قدس اور عالم ظلمات کے بالکل وسط میں ہے یہاں یا تو وہ لوگ ہوں گے جن کے گناہ اور نیکیاں بالکل برابر ہیں جو نہ جنت میں جاسکتے ہیں اور نہ جہنم کا کندہ بن سکتے ہیں یا اس جگہ سے ملائکہ ہوں گے یا پھر نیک آدمی رہیں گے۔ قرآن کی حسب ذیل آیات سے اعراف کا ثبوت بہم پہنچا ہے کہ "بینھما حجاب" "وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیمٰھم" "ونادوا اصحٰب الجنۃ ان سلٰم علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون" "واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحٰب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظٰلمین" اسی طرح ان احادیث سے بھی جن کو سیوطی نے بدور السافرہ میں ذکر کیا ہے اعراف کا ثبوت ملتا ہے اور اسی طرح فتوحات مکیہ وغیرہ کی تصریحات نے بھی اعراف کا وجود ثابت کیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ مقام ہمیشہ کیلئے نہ ہوگا۔ شاہ صاحب کا اعراف کے متعلق یہ خیال جس کا اظہار اپنی تصنیف میں کیا ہے عجیب وغریب ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہشت و دوزخ اس وقت موجود ہیں۔ آدم وحوا علیہما الصلوٰۃ والسلام کے واقعات سے ان کے اس وقت موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس وقت تو وہ موجود نہیں۔ قیامت کے موقع پر پیدا کر دی جائیں گی اور اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جہنم اور بہشت کبھی فنا نہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمیشہ کیلئے پیدا کیا ہے۔ ایک دفعہ معدوم ہونے کے بعد جب دوبارہ وجود میں لائی جائیں گی تو اب معدوم ہونے کا کوئی امکان نہیں اب فنا و عدم کا کیا ذکر اب تو وہ وقت ہے کہ موت کو موت آئے گی۔

☆☆☆☆☆☆
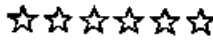
علاماتِ قیامت

آنحضور ﷺ نے قیامت کے متعلق اور عالم آخرت کے احوال کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ وہ سب کچھ صحیح اور پیش آنے والے واقعات کی بالکل صحیح خبریں ہیں، جن میں کسی قسم کا کوئی شبہ اور شک نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے قریب، آفتاب[1] بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوگا اور اسی دن توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا۔

بلاشبہ ایسا ہی ہوگا اس میں ذرا بھی شک نہیں یا دجال[2] کے خروج کے متعلق آپ ؐ نے اطلاع دی ہے یا اسی طرح دابۃ الارض[3] کے سلسلہ میں آپ کی بیان کردہ تفصیلات ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام[4] کے نزول کے متعلق آپ ﷺ کی تصریحات ہیں یا نفخ صور کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے اور اسی طرح بقیہ قیامت کی علامتیں جو کچھ آپ ﷺ نے بتائی ہیں وہ سب صحیح ہیں اور اسی پر کیا موقوف ہے بلکہ جو بھی خبر آپ ﷺ سے ہم تک پہنچی وہ حق ہے اور اس کے حق ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

[1] بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ آفتاب مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔ مخلوق اس کو دیکھے گی پھر ایمان لائے گی مگر اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہوگا۔ احادیث میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہوگی اچانک رات نہایت لمبی ہو جائے

گی۔ بچے چیخ و پکار کریں گے چونکہ چرند، پرند جنگل میں جانے کیلئے بے چین ہوں گے۔ مسافر اس رات کی درازی سے تنگ دل ہوں گے۔ ہر شخص کی زبان پر توبہ و استغفار ہوگا جب یہ رات تین یا چار راتوں کی برابر لمبی ہو جائے گی تو آفتاب بہت بے نوری کے ساتھ جیسا کہ گہن کے وقت میں ہوتا ہے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا اور اتنا بلند ہو کر جتنا چاشت کے وقت ہوتا ہے، غروب ہو جائے گا اور پھر حسب معمول مشرق سے طلوع ہوگا لیکن اس کے بعد نہ کسی کا ایمان قبول ہوگا اور نہ کسی کی توبہ مقبول ہوگی۔ یاد رکھنا چاہئے کہ آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا محال نہیں ہے۔ خدا کو ہر قسم کی قدرت ہے بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ دھواں اور غبار ایسا ہوگا جس کی وجہ سے بالکل رات معلوم ہوگی جب یہ گرد و غبار چھٹ جائے گا تو اس وقت آفتاب غروب ہوتا معلوم ہوگا۔ سمجھنے والے سمجھیں گے کہ مغرب سے نکلا ہے۔ یہ تاویل انہیں لوگوں کیلئے کارآمد ہو سکتی ہے جو خدا کی بے پناہ قدرت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوں۔

۲ یہ شخص قوم یہود سے ہوگا۔ احادیث میں ہے کہ اس کا لقب مسیح ہوگا۔ اس کی داہنی آنکھ کانی ہوگی اور انگور کے دانہ کے برابر اس میں ناخونہ ہوگا۔ حبشیوں کی طرح اس کے بال نہایت پیچیدہ ہوں گے۔ ایک گدھے پر سواری کرے گا اور پیشانی کے بالکل وسط میں کفر لکھا ہوگا۔ جس کو ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ ملک شام اور عراق کے درمیان ظاہر ہو کر نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اصفہان کے ستر ہزار یہودی اس کی نبوت کی تصدیق کریں گے۔ اس کے ساتھ آگ ہوگی جس کو دوزخ کہے گا اور ایک بہشت ہوگی جو در حقیقت باغ ہوگا۔

بخاری و مسلم میں ہے جس کو یہ بہشت کہے گا وہ جہنم ہوگی اور جس کو یہ دوزخ کہے گا وہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے بہشت ہوگی۔ اس کے ہاتھ پر بعض عجیب کرشمے ظاہر ہوں گے۔ یہ در حقیقت استدراج ہوں گے اور کفار کے ہاتھ پر استدراج عقلاً و شرعاً ظاہر ہو سکتے ہیں۔ دجال دجل سے مشتق ہے جس کے معنی تلبیس و مکر کے آتے ہیں۔ اس طرح ہر مکار آدمی کو دجال کہہ سکتے ہیں لیکن یہ موعود شخص آنحضورﷺ کی اطلاع کے مطابق ایک ہی ہوگا۔

۳ جس روز آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا اسی روز یا اس سے اگلے دن یہ جانور مکہ مکرمہ کے ایک پہاڑ سے نکلے گا، یہ لوگوں سے بات چیت کرے گا اور قیامت کی خبر دے گا۔ مومنین کے چہرے پر ایک نورانی نشان لگائے گا جس سے ان کے چہرے منور ہو جائیں گے اور کافروں کی آنکھوں کے درمیان ایک مہر لگائے گا جس سے ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔

۴ دجال کے خروج کے بعد امام مہدی دمشق کی جامع مسجد میں نماز کیلئے کھڑے ہوں گے کہ یکایک عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے شرقی منارہ پر دو فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہوئے نزول فرمائیں گے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام مہدی کی معیت میں دجال پر حملہ آور ہوں گے اور لد میں جو کہ شام میں کوئی پہاڑ یا گاؤں ہے پہنچ کر اس کو قتل کر دیں گے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ امام مہدی اور عیسیٰ دو علیحدہ شخصیتیں ہیں ان دونوں کو ایک سمجھنا شدید غلطی ہے۔

ایمان کی تعریف پر ایک تفصیلی نظر

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آپ آنحضورﷺ کو صادق و مصدوق سمجھیں، آپ کی رسالت پر دل سے اعتقاد رکھیں اور زبان سے اس کی گواہی وشہادت دیں۔ ایمان کی حقیقت اصل میں ''تصدیق قلبی ہے اور رہا زبان سے اس کا اقرار کرنا تو یہ اقرار صرف اس لئے ہے تاکہ ظاہر میں اب آپ پر مسلمان ہونے کے احکام جاری کئے جاسکیں اور یہ بھی ہے کہ زبانی اقرار تصدیق قلبی کی علامت بھی ہے کیوں کہ زبان دل کی ترجمان ہے۔ ہاں یہ یادرکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص گونگا ہے یا جبراً اس سے کلمہ کو کہلایا گیا یا پھر زبان سے اقرار کرنے کی اسے مہلت نہ مل سکی لیکن اس کے قلب میں تصدیق موجود تھی تو ایسی تمام صورتوں میں زبانی اقرار کی ضرورت نہ ہوگی۔ محدثین کے یہاں ایمان کے تین اجزاء ہیں۔

تصدیق اقرار، عمل، اسی لئے وہ ایمان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایمان، تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے اور ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ اختلاف محض لفظی ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیونکہ جو کچھ محدثین کہتے ہیں کامل ایمان تو حقیقۃً یہی ہے، بے عمل کا ایمان بہرحال ناقص ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ایمان، تصدیق قلبی کا ہی نام ہے، اعمال اس کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اگرچہ کمال ایمان، اعمال صالحہ ہی سے وجود میں آتا ہے۔

ایمان کی مثال: آپ سمجھنے کیلئے، ایمان کو ایک درخت سمجھئے کہ تصدیق اس کی جڑ ہے اور اعمال و طاعات جو اس تصدیق کے ثمرات و نتائج ہیں، شاخ و برگ، گل و میوہ کے مشابہ ہیں۔ کہنے کو تو اس درخت کو بھی درخت کہتے ہیں۔ جس میں نہ برگ و بار ہو نہ شاخ و گل ہو لیکن در حقیقت درخت وہی ہے جس پر پھل بھی ہوں اور پتے بھی۔ گل و شگوفے بھی ہوں اور شاخ بھی۔ اسی طرح بس ایمان ہے کہ ناقص ایمان کو بھی ایمان کہیں گے لیکن کامل تو وہی ایمان ہوگا جس کے ساتھ اچھے اعمال کا حسین جوڑ بھی ہو۔ دیکھئے قرآن مجید میں ہے کہ:

ان الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت

جو ایمان لائے اور اعمال اچھے کئے اس سے ایمان اور اعمال دونوں ایک دوسرے کے مغائر صاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ زید کے پاس یہ چیز بھی ہے اور فلاں چیز بھی، تو آپ فوراً سمجھیں گے کہ زید کے پاس دو علیحدہ جنس کی چیزیں ہیں، اس کلام سے یہ سمجھنا کہ وہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں عرف عام میں قطعاً غلط ہوگا۔ بس اسی طرح ایمان اور عمل بھی دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ تاہم ایمان کا کمال یہی ہے کہ اعمال حسنہ اس کے ساتھ ہونا چاہیں۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایمان محض آنحضور ﷺ کے سچا جاننے کا نام نہیں ہے۔ تصدیق اور چیز ہے اور یہ علم کہ آپ صادق و مصدوق تھے۔ قطعاً ایک دوسری شے ہے۔ تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ آپ میں اذعان و قبول ہو، اسی مفہوم کی ادائیگی فارسی میں (گرویدن) سے ہوسکتی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دل قبولیت کے رنگ میں ڈوب جائے اور یقین کی تجلیات کا مظہر آپ کا باطن ہو، رہا علم تو وہ صرف جاننے کا نام ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، سارا عرب اور خصوصاً اہل کتاب آپ کے متعلق خوب جانتے تھے کہ آپ ہی خاتم الانبیاء ہیں۔ بلکہ آپ کی واقفیت اولاد سے بھی زیادہ ان کو حاصل تھی۔ ''یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم'' آپ کا ایک ایک وصف، خصوصیات، امتیاز، سیرت، عادات، و خصائل، جائے پیدائش، وطن کون سی چیز ایسی تھی جو ان کی کتابوں اور زبانوں پر نہیں تھی۔

موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مدینہ میں آ آ کر صرف اسی شوق وذوق میں قیام کر رہے تھے کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے۔ باپ اپنی اولاد کو وصیت کرتے کہ اگر تم کو اس موعود نبی کا وقت مل جائے تو تم ان کی حمایت ونصرت کرنا۔ ہمارا ان کو سلام پہنچانا اور ان سے کہنا کہ ہم ان پر ایمان لائے۔

پوری تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود سے زیادہ آپؐ کے سلسلہ میں معلومات کسی قوم کی نہ تھیں لیکن جب نبوت کا یہ مہر منیر کفر وجہالت کے بادلوں کی اوٹ سے عالم پر نور فگن ہوا تو بدبختی نے اپنے قدم جمائے۔ نتیجۃً یہود کی بصیرتوں پر ایسے پردے پڑے کہ حسد وعناد کی راہ میں پڑ کر آپ کا صاف انکار کر بیٹھے۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر آپ تصدیق اور علم میں فرق خوب کر سکیں گے۔ یہاں پر یہ بھی معلوم ہوا کہ عقل وعلم، ہدایت ربانی اور توفیق الٰہی کے بغیر ذرا بھی کام نہیں آتے۔

وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلماً وعلواً

ازراہِ ظلم وکبر اس کا انکار کر بیٹھے۔ حالانکہ ان کے دل اس پر یقین رکھتے تھے۔

اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ **نعوذ باللہ من علم لا ینفع وقلب لا یخشع** جس علم کے نتیجہ میں حق کی راہ سامنے کھل کر نہ آ جائے وہ علم علم نہیں بلکہ کھلی جہالت ہے۔

کیا ایمان میں کمی وزیادتی ہوتی ہے؟:

ایمان سے متعلق مباحث میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ ایمان میں زیادتی وکمی ہوتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب بہت مختصر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایمان کی حقیقت، صرف تصدیق قلبی ہے اور تصدیق قلبی ایک ایسی شے ہے جس میں تعدد قطعاً نہیں تو معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی وکمی بھی نہیں ہوگی۔ زیادتی وکمی ان چیزوں میں ہوتی ہے جن میں تعدد وتکثر ہو، ہاں اگر اعمال کو ایمان کی حقیقت میں تصدیق کے ساتھ شمار کیا جائے تو پھر اعمال کی زیادتی وکمی سے ایمان میں بھی ضرور فرق پیدا ہوگا لیکن اعمال جیسا

کہ بتایا گیا ایمان کے اجزاء میں داخل نہیں ہیں تو ان کی کمی وبیشی سے کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ امام اعظمؒ کا ایمان کے متعلق یہ کہنا کہ نہ وہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کے راست ہونے میں کیا شبہ ہے؟۔

امام اعظم نے اپنے اس مختصر کلام میں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ اہل سنت والجماعت کی یہ رائے کہ اعمال ایمان کے اجزاء میں داخل نہیں ہیں ٹھیک اور درست ہے۔

ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان واسلام میں کوئی فرق نہیں لیکن اس کے باوجود ایمان سے عموماً تصدیق قلبی واحوال باطنی مراد ہوتے ہیں اور اسلام سے اکثر وبیشتر ظاہری اطاعت اور فرمانبرداری مراد لی جاتی ہے، قرآن کریم کی اس آیت سے کہ:

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا (القرآن الحکیم)

''اور کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے تو کہہ کہ تم ایمان نہیں لائے پھر تم کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔''

یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ جو مسلمان ہے وہ مومن بھی ہے اور مومن، مسلمان بھی ہے۔ ان دونوں میں کوئی مغایرت واختلاف نہیں۔

ایک اور بحث: ایمانیات کے ذیل میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ''خدا نے اگر چاہا تو میں مومن ہوں۔'' احناف اس قول کی اجازت نہیں دیتے اور شوافع کے یہاں اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر آپ غور سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ دونوں جماعتوں کا یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ دیکھئے اگر کوئی شخص مذکورہ بالا جملہ دوہرا کر ایمان وتصدیق میں شک وتردد کا اظہار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس جملہ کا زبان پر لانا جائز نہیں ہوسکتا اور اگر خدا کے ذکر سے حصول

برکت مراد ہے غرور واعتماد کی نفی مطلب ہے تو اس کے جائز ہونے میں پھر کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ تاہم ایک ایسی بات جو پہلودار ہے ابہام جس میں موجود ہے۔ متعدد محمل پر اتارنے کا جس میں امکان ہے اس کا زبان پر نہ لانا ہی اچھا اور مناسب ہے۔

وہ وقت جب ایمان قبول نہیں ہوتا:

عقائد اسلامی میں یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ "باس" کا ایمان غیر مقبول ہے، باس کے معنی شدت اور عذاب کے ہیں لیکن یہاں پر باس سے مراد سکرات موت اور احوال آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا ہے۔ یہ مناظر موت کے وقت، آنکھوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

احادیث میں ہے کہ موت کے وقت ہر شخص کو اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔ مومن کے سامنے بہشت بریں کے شاداب مناظر پیش کئے جاتے ہیں اور کافر کے روبرو جہنم کا آتش کدہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے جب کافر اس وقت ایمان لائے تو اس کا ایمان کس طرح قابل قبول ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ایمان میں اصل یہ ہے کہ آپ غیب پر اپنے اختیار سے ایمان لائیں۔ خدا کے اوامر پر عمل کرنے کا ارادہ ہو اور مالک حقیقی کے احکام کی بجا آوری کیلئے ہمہ تن آمادہ تیار ہوں اور اس کشمکش کے عالم میں ایمان قطعاً اضطراری ہوگا اور غیب پر ہرگز نہ ہوگا جیسا کہ قیامت میں تمام کفار چیخ کر کہیں گے کہ:

ربنا ابصرنا وسمعنا فارجعنا نعمل صالحاً انا موقنون.

"اے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو پھر بھیج ہم کریں بھلائی، ہم کو یقین آگیا"۔

یعنی اے خدا! آج ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا ہمارے کانوں نے سن لیا اور ہم کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ تیرے پیغمبروں نے ہم سے کہا تھا سب ٹھیک تھا اور اس میں کوئی بات بھی غلط نہ تھی۔ اے اللہ اب تو ہم کو دنیا میں پھر بھیج دے۔ ہم وہاں اچھے عمل کریں گے اور ثواب کے مستحق ہوکر آئیں گے۔

دیکھئے کس قدر کھلا اعتراف ہے قبولیت حق کا کیسا اعلان ہے اور ایمان کا کتنا واشگاف اظہار ہے، لیکن اس کے باوجود اس وقت نہ ان کا یہ ایمان قبول ہوگا نہ یہ اعتراف وانابت ذرا بھی کام آئے گا۔ تمام اہل حق اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ "حالت یاس" کا ایمان قبول نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول کرتے ہیں۔ بشرطیکہ غرغرہ کے وقت میں توبہ نہ کی ہو۔ غرغرہ سے مراد نزع دجان نکلنے کا وقت اور روح کا حلق تک پہنچ جانا ہے۔ قرآن مجید میں موجود ہے کہ: **فلم یک ینفعھم ایمانھم ما رائو باسنا.** "یعنی عذاب الٰہی کو بچشم خود دیکھ لینے پر ایمان لانا کیا فائدہ رکھتا ہے؟ کچھ نہیں"۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے کہ:

ولیست التوبة للذین یعماون السیئات حتی اذا حضر احد ھم الموت قال انی تبت الأن.

"ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں، جو برائیاں برابر کرتے رہے اور جب آ پہنچی موت تو بولے کہ "توبہ ہے میری"۔

اس آیت ربانی سے ہمارا مدعا بخوبی ظاہر ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ حالت یاس سے علامات قیامت، مثلاً طلوع شمس، مغرب سے کوئی شخص مراد لے، چنانچہ بعض مفسرین نے حالت یاس کی تعیین طلوع شمس از جانب مغرب سے کی ہے، لیکن یہ آخری آیت تو بالکل صاف اعلان کرتی ہے کہ سکراتِ موت کے عالم میں ایمان لانا ذرا بھی مفید نہیں ہے۔ یہ دلائل جو قرآن وحدیث سے جمع کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ حالت یاس اور غرغرہ میں گناہوں سے بھی توبہ کرنا مقبول و بارآور نہیں ہے۔ جیسا کہ اس حالت میں ایمان کوئی فائدہ بخش نہیں تھا۔ اشاعرہ، ماتریدیہ اور فقہاء کی کثیر جماعت کا یہی خیال ہے۔ لیکن علماء کی ایک بڑی جماعت کی یہ رائے ہے کہ حالت یاس میں گناہوں سے توبہ اگر کی جائے تو قبول ہوگی لیکن ایمان اس حالت میں قطعاً قبول نہیں ہوسکتا۔

حواشی

۱ اس موقع پر حضرت العلام مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کی تصریحات بھی سامنے رکھنی چاہئیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ درحقیقت ایمان خداوند تعالیٰ سے اس کی اطاعت کے التزام کا ایک معاہدہ ہے اور اعمال صالح اس معاہدہ کی دفعات ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ التزام ایک امر بسیط ہے۔ جس میں تجزی، تبعض اور زیادتی و نقصان کا امکان نہیں۔ قرآن کریم نے جا بجا ایمان کو عہد اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً ''الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ''

۲ سیدنا الامام الکشمیری نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ''ایمان کا ترجمہ جاننا، یقین کرنا، یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان تراجم سے ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی بلکہ صحیح ترجمہ ماننا ہے جس کا مفہوم التزام طاعت بھی ہے، شاعر کہتا ہے:

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں ۔۔۔ کہنا نہیں مانتے تم کسی کا

جناب مولانا بدر عالم صاحب حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی یہ رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

اردو داں حضرات کو حضرت استاذ (مولانا محمد انور شاہ) کا ایک یہ ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ (ترجمان السنۃ جلد نمبر ا ص ۷۷ ۴)

۳ حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی و کمی کا قول امام اعظم کی طرف منسوب ہے۔ اس میں کافی تردد و خلجان ہے کیونکہ امام صاحب سے اس سلسلہ میں کوئی تحقیقی بات نقل نہیں کی گئی ہے۔ فقہ اکبر میں اگرچہ امام صاحب کی یہی رائے نقل کی گئی ہے لیکن فقہ اکبر، امام صاحب کی تصنیف نہیں ہے بلکہ وہ آپ کے شاگرد ابو مطیع بلخی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے خود فقہ اکبر کے متعدد نسخے دیکھے تو تمام نسخوں میں مضامین کا اختلاف پایا۔ جس کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ فقہ اکبر امام جیسے متبحر اور ناقد جامع کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کتاب العالم والمتعلم و سبط صغیر اور کبیر بھی آپ کی تصانیف نہیں کہی جا سکتیں۔ اس بناء پر ایمان کے متعلق امام صاحب کی یہ رائے معلوم نہیں ہوتی مگر ابو عمرو مالکی نے موطا کی شرح میں اس قول کو امام صاحب کا قول قرار دیا ہے اور ابو بکر مالکی نقل کی حد تک بڑے محتاط اور ثقہ شخص ہیں۔ اس لئے اب امام اعظم کے مذہب کی اس طرح تفصیل کی جائے گی کہ امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان جو تمام اہل ایمان میں قدر مشترک کی حیثیت سے موجود ہے اور جس پر ایمانی اخوت کا مدار ہے۔ یہ ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا۔ البتہ طاعات اور حسنات کے اعتبار سے ایمان میں کمی اور بیشی ضرور ہوتی ہے۔ امام صاحب اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس طرح امام شافعی اور امام اعظم میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا ہے۔ (فیض الباری ملخصاً ج ا ص ۶۰)

۴ (الامام الکشمیری لکھتے ہیں کہ تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام اسلام ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو ایمان کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی حقیقت ہے لیکن اختلاف مواطن سے اس کے نام مختلف ہو گئے اور اگر ایمان صرف قلب ہی میں ہو اور اسلام محض اعضاء پر نمایاں ہو تو یہ متغایر حقیقتیں ہیں۔ اب ان میں اتحاد نہ ہو گا۔ (فیض الباری ج ا ص ۶۹)

فرعون[1] اور اس کا ایمان: اس بحث کے نتیجہ میں ہر شخص سمجھ گیا ہوگا کہ فرعون کا ایمان جو دریائے نیل میں غرق ہونے کے وقت اس نے اختیار کیا قبول نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہلاکت خیز موجوں میں پھنس کر زندگی سے مایوسی قطعاً حالت یاس ہے۔ اب اضطرار کے بے تاب لمحہ میں اختیار کے پرسکون اوقات ختم ہو چکے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور مشائخ مجتہدین وفقہاء سب فرعون کے کافر ہونے کے قائل ہیں۔ شریعت میں بھی جا بجا اس کا ذکر ناگوار انداز اور اس کی حالت کو قابل ندامت قرار دیا ہے۔ کفر واستکبار میں اس کی شخصیت ضرب المثل ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات اس کے کفر اور جہنمی ہونے کا واشگاف اعلان کرتی ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ:

فاخذه الله نكال الأخرة والاولى.

اللہ نے اس کو اولین والآخرین کیلئے باعث عبرت بنا دیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

"يقدم قومه يوم القيامة فاوردهم النار"

اپنی قوم کی پیشوائی کرتا ہوا آئے گا اور پھر اُن کو جہنم میں اتار دے گا۔

جس شخص کو زبان عربی اور اس کی نزاکت سے ادنیٰ درجہ کا بھی مس ہے وہ خوب سمجھتا ہے کہ اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ سردار بن کر، فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان سب کے ساتھ خود بھی جہنم رسید ہوگا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ قوم تو جہنم

---

[1] فرعون شاہانِ مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں، تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوکر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ فرعون موسیٰ کے متعلق عام مفسرین کی رائے ہے کہ یہ بھی عمالقہ کے خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان بتایا جاتا ہے۔ ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان اباء تھا، ابن کثیر نے اس کی کنیت ابومرہ بتائی ہے لیکن جدید تحقیقات اور کتابات کو سامنے رکھنے کے بعد مصری محققین ایک نئی تحقیق پیش کی ہے وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون ریمسس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہوکر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہوتا ہے۔ اس تحقیق روایت کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی کا ایک مستقل مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

کا کندہ بن جائے گی اور فرعون آتشکدہ جہنم سے صاف بچ آئے گا۔ حدیث میں امراء القیس[1] کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تمام شعراء کو ساتھ لے کر جہنم میں سیدھا جائے گا۔ ''یقدم الشعراء الی النار'' اس کا بھی مطلب یہی ہے کہ امراء القیس بھی جہنم ہی میں ہوگا یہ معنی تو کوئی بھی نہیں لیتا کہ وہ خود بچ جائے گا اور باقی شاعر جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اسی طرح یہ بھی ارشاد ہے کہ:

فاستکبر هو وجنوده فی الارض بغیر الحق وظنوا انهم الینا لا یرجعون (القرآن الحکیم)

''اس نے اور اس کی فوج نے ناحق زمین میں غرور وتکبر کا مظاہرہ کیا اور سمجھے کہ ان کو ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے''۔

یعنی فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق فتنہ وفساد کیا اور یہ بھی سمجھے کہ ہم کو خدا کے سامنے پیش نہیں ہونا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ: ''فاخذناه وجنوده فنبذنا هم فی الیم'' یعنی ہم نے ان کو قہر وعذاب کی گرفت میں جکڑ لیا اور اس کو اس کے لشکر کے ساتھ دریائے خون میں اٹھا ڈالا۔

''فانظر کیف کان عاقبة الظالمین'' یعنی دیکھو ظالمین اور متکبرین جو کہ خدا اور اس کے پیغمبر کے ساتھ تکبر وعناد کا معاملہ کرتے ہیں۔ پھر اس کی پاداش میں دنیا اور آخرت میں کس طرح رسوا کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ: ''وجعلناهم ائمة یدعون الی النار'' فرعون اور اس کے لشکر کو جہنمیوں کا امام اور راہنما بنا دیا گیا ہے۔ وہ سب کو جہنم کی جانب بلائے گا۔ ''ویوم القیامة لاینصرون'' قیامت کے روز نصرت ومدد نہ ہوگی۔ بلکہ وہ رسوا اور ذلیل کیا جائے گا۔ ''واتبعنا هم فی هذه الدنیا لعنة'' دنیا میں اس پر اور اس کے لشکر پر لعنت کی گئی ہے۔ ''ویوم القیامة هم من المقبوحین'' اور

---

[1] عرب جاہلیت کا مشہور شاعر اس کا نام حندج اور باپ کا نام حجر تھا۔ قبیلہ کندہ صوبہ نجد کا نوابزادہ تھا۔ عام طور پر امراء القیس کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضور ﷺ نے بعض اوقات الملک الضلیل بھی فرمایا ہے۔ یعنی (بگڑا نواب) اور ایک خاص واقعہ کے باعث ذوالقروح (آبلوں والا) بھی اس کا لقب ہوا۔

قیامت میں وہ اور اس کا لشکر ذلیل وخوار ہوں گے۔ قرآن کریم کی یہ مختلف آیات جو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کی گئیں اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ فرعون کی یہ حالت ہے اور اس کے انجام کی یہ تصویر ہے جو قرآن آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یقیناً اگر وہ مسلمان ہوتا اور دنیا سے بحالت ایمان اٹھتا تو کبھی بھی قرآن اس گھناؤنی شکل میں اس کو پیش نہ کرتا۔

یہ ممکن ہے کہ آپ اس کے تکبر واستکبار کو علو وظلم کو دنیا کی حالت اور ماضی کی ایک داستان پر محمول کریں لیکن دریافت یہ کرنا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت کہ: "ویوم القیام، هم من المقبوحین" کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ اور اگر ان آیات میں صرف اس کا لشکر ہی مراد لیا جائے اور فرعون کو استثناء کرنے کی کوشش ہو تو وہ آیات جن میں لشکر اور فرعون دونوں کا پہلو بہ پہلو ذکر ہے اس کی آپ کیا تاویل کرسکیں گے؟

میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ اگر وہ مسلمان تھا، مومن تھا، ایمان اس کا قبول تھا، توبہ اس کی شرف قبولیت حاصل کر چکی تھی تو پھر اللہ نے اس کی تعریف میں کیوں بخل کیا، اور اس کے حسن انجام کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ اس حقیقت کو چھپانے میں آخر کیا راز تھا؟ یا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو کہنا چاہیے تھا کہ فرعون ہمارا ایک ایسا بندہ تھا جس نے عمر بھر کفر وعصیان کیا لیکن آخر وقت میں ہماری مدد اور توفیق اس کے شامل حال ہوئی اور اچانک کفر کا یہ امام، ایمان کا منادی بن گیا۔ لیکن اس کے بجائے اللہ تعالیٰ قدم قدم پر فرعون کی مذمت کرتے ہیں اور کسی موقع پر بھی ایمان واسلام کی صفات کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ہاں یہ ایک یعنی:

حتی اذا ادر که الغرق قال امنت انهٔ لا الٰه الا الذی امنت به بنو اسرائیل وانا من المسلمین۔

"جب غرق ہونے لگا تو بولا کہ میں بھی اسی معبود پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔"

لیکن اگر اس آیت کے سیاق وسباق پر بھی غور کیا جائے تو یہ حقیقت خوب نکھر کر

سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرعون کے ایمان کو قبولیت کا جامہ ہرگز نہیں پہنا رہے ہیں بلکہ یہاں بھی یہی بتایا جا رہا ہے کہ عمر بھر اس ظالم نے استکبار و عناد سے کام لیا۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اس کیلئے اور اس کی قوم کیلئے ہلاکت کی بددعا کی، دعا قبول ہوئی اور عذاب الٰہی مسلط کر دیا گیا۔ جب اس نے اپنی چشم سر سے عذاب کو دیکھ لیا تو ایمان لانے کیلئے تیار ہوا حالانکہ اس وقت کا ایمان کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ آج قدرت کے خاموش تازیانے اس سے دریافت کرتے ہیں کہ بتا تو سہی وہ کفر و عناد کیا ہوا۔ فتنہ و فساد کی وہ تمام سنتیں جن کا تو امام تھا آج انہیں کیوں بھلائے ہوئے ہے۔ آج ہم تجھے دنیا میں بھی رسوا کر کے چھوڑیں گے۔ اس طرح کہ تیری نعش[1] دریا کی گہرائیوں سے اُچھل کر، دریا کی سطح پر تیرتی نظر آئے گی، دنیا دیکھ لے گی کہ اس بدبخت کا انجام کیا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور اپنی زندگی اللہ کے مقابلہ میں تکبر و علو کے ساتھ گزاری۔ یاد رکھو! ایسے کور بختوں کا حشر دنیا میں رسوائی، آخرت میں عذاب الیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

فاخذه الله نكال الأخرة والاولى ان في ذلك لعبرة لمن يخشى.

"اللہ نے اس کو اولین اور آخرین کیلئے سرمایہ عبرت بنا دیا۔ بے شک اس کے انجام سوء خاتمہ میں ڈرنے والوں کیلئے عبرت و بصائر کے سامان ہیں"۔

بعض خوش فہموں نے فرعون کی بیوی آسیہ کے اس قول سے کہ "**قرت عين لي ولك لاتقتلوه**" (یعنی اس نے فرعون سے کہا کہ یہ بچہ (موسیٰ) میری اور تیری آنکھوں

---

[1] (مصر کے عجائب خانہ میں فرعون کی نعش آج بھی موجود ہے۔ محمد احمد عدوی نے اپنی تصنیف "دعوۃ الارسل الی اللہ" میں لکھا ہے کہ: "اس کی نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ نہیں ہے، غالباً دریائی مچھلی وغیرہ نے خراب کیا ہو"۔ لیکن اس کی وجہ یہ بھی کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ ناک ہی دراصل کبر و غرور استکبار و علو کا نشان ہے۔ اردو میں بھی مشہور ہے کہ "میں ناک نہیں کٹنے دوں گا"۔ فرعون کی پوری نعش کو باقی رکھ کر صرف ناک کو نقصان پہنچنا گویا کہ اس کے استکبار و علو کی جڑ ہی کاٹ دینے کا اہتمام کی جانب اشارہ ہے، یعنی وہی ناک جو دنیاوی زندگی میں سب سے اونچا رہنے کی خواہش مند ہے، آج پوری نعش موجود ہے لیکن غرور و تکبر کا یہ سیاہ نشان ہی نہیں ہے۔

کی ٹھنڈک ہے اس کو قتل مت کر) استدلال کیا ہے کہ فرعون مسلمان تھا، کیونکہ آسیہ موسیٰ کو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دے رہی ہے اور ظاہر ہے کہ پیغمبر ایک مسلمان ہی کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ استدلال قطعاً واہی ہے، کیونکہ آسیہ کا فرعون کے متعلق یہ سمجھنا کہ موسیٰ اس کیلئے بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں آسیہ کے فرعون کے بارے میں حسن ظن سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، یا (اگر ایسا کوئی تخیل فی الواقع عارضی طور پر فرعون کیلئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا تھا) تو اس میں حکمت یہ تھی کہ موسیٰ ایک ظالم کے ہاتھ سے محفوظ ہو جائیں، اس طرح اس کے ہاتھ سے ذبح نہ ہوں جیسا کہ وہ دوسرے بچوں کو تہہ تیغ کر رہا تھا، یا موسیٰ کو فرعون کے خونیں ہاتھوں سے بچانے کیلئے آسیہ کی ایک تدبیر تھی۔ کیونکہ وہ اپنی فراست اور الہام سے شاید موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مستقبل کی کچھ دھندلی تصویر دیکھ چکی تھی۔ آسیہ نے موسیٰ کو اٹھایا اس کا انجام کیا ہونا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدواً وحزناً

''پھر اٹھالیا اس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو ان کا دشمن اور کڑھانے والا''

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون مسلمان نہ تھا کیونکہ اگر مسلمان ہوتا تو کوئی بھی پیغمبر کسی مسلمان کا دشمن نہیں ہوتا[1]۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرعون سے موسیٰ کی عداوت صرف دنیاوی زندگی میں تھی۔ لیکن یاد رکھئے کہ اس کے جواب میں ہم بھی یہ کہیں گے کہ پھر موسیٰ فرعون کیلئے آسیہ کے کہنے کے مطابق آنکھوں کی ٹھنڈک صرف اسی زندگی میں تھے، اس دوسری زندگی میں دائمی عداوت لوٹ آئی ہے[2]۔

---

[1] (آسیہ کے اسلام و ایمان کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ وہ خفیہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان رکھتی تھیں۔ اس لئے اب مومنہ و مسلمہ ہونے کی بنا پر موسیٰ ان کے دشمن نہیں ہو سکتے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرعون کی مملکت اور ظاہری شان و شوکت کا خاتمہ بہرحال آسیہ کا بھی نقصان تھا۔

[2] شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر دو فریق کے استدلال کے نتیجہ میں بات گھوم پھر کر صرف دنیاوی زندگی تک رہ جاتی ہے۔ یعنی اس عالم میں یا موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کیلئے عداوت ثابت ہوگی یا مودت و اخوت اور دلائل کے معارض ہونے کی بنا پر نہ عداوت ہی ثابت ہو سکی اور نہ اخلاص و یگانگت، رہا آخرت کا معاملہ تو اس میں موسیٰ و فرعون کے باہمی تعلقات کو عداوت کے رنگ میں دکھانے کیلئے قرآن کریم کے دوسرے بیانات مطلوب ہوں گے۔

بہر حال قرآن کریم سے فرعون کے متعلق جو نظریہ مختلف آیات کو سامنے رکھ کر بنتا ہے وہ یہی ہے کہ جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اس کے علاوہ احادیث، اجماع امت، صحابہ رضوان علیہم اجمعین، تابعین، علماء مجتہدین وغیرہم سب فرعون کی ضلالت و گمراہی، کفر و عناد پر متفق ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر احادیث و قرآن کے کسی بھی پیرایہء بیان سے فرعون کا ایمان مفہوم ہوتا تو ہرگز ہرگز کفر و عناد میں اس کی شخصیت ضرب المثل نہ بنتی۔

روایت میں ہے کہ جب ابو جہل غزوۂ بدر میں مارا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ''اس امت کا فرعون آج ختم ہوا''۔

اگر فرعون اس دنیا سے بحالت ایمان اٹھا ہے تو ایک شقی ازل (ابو جہل) سے اس کو تشبیہ دینا کب درست ہوتا۔ اگر کوئی خوش فہم کہے کہ فرعون کو ابو جہل سے جو تشبیہ دی گئی ہے وہ اس کے زمانہء حیات کو سامنے رکھ کر ورنہ انجام فرعون اور ابو جہل کا مختلف ہے۔ تو سن لیجئے کہ شریعت میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ ایک شخص کو توبہ کرنے کے بعد اسلام لانے پر برا بھلا کہا گیا ہو۔ کیونکہ مشہور ہے کہ اسلام پہلی زندگی کے تمام برے آثار کو دھو ڈالتا ہے اور کفر کے امام، شرک کے مناد جو آنحضورﷺ سے کھلی عداوت رکھتے تھے جب مخلصانہ ایمان لے آئے تو ان پر سابق زندگی کی وجہ سے نہ کوئی نکیر تھی نہ مواخذہ۔[1]

یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں فرعون کے متعلق ایسی شدید وعید دیکھ کر علماء اور مشائخ میں سے کسی کو اس کی جرات نہ ہوئی کہ اس شقی کو مومن یا مسلمان کہے۔ صرف شیخ محی الدین ابن عربی[2] نے اپنی تصنیف ''فصوص الحکم'' میں فرعون کو مومنین کے زمرہ میں شمار

---

[1] آنحضور نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منع فرمایا کہ عکرمہ کو ابن ابو جہل نہ کہا جائے گویا کہ ایک مسلمان کیلئے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ کفر کے کسی مناد کی جانب اس کی نسبت ہی کی جائے۔ حالانکہ عکرمہ تو بیٹے تھے اور ابو جہل ان کا باپ۔

[2] شیخ محی الدین ابن عربی آپ کا نام محمد ہے اور والد کا نام علی بن محمد عربی ہوے۔ شیخ تصوف و سلوک کی دنیا کے ایک عظیم شخصیت ہیں۔ وحدت الوجود ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ نفحات الارض میں شیخ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ ان کی ولادت اندلس کے مضافات مرسیہ میں دوشنبہ کی رات ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو ہوئی ہے اور وفات جمعہ کی شب ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۱ھ ہجری دمشق میں ہوئی۔ اہل قاسون جو کہ صالحیہ کے نام سے مشہور ہے وہیں ان کی قبر ہے۔

کیا ہے۔ ابن عربی یا تو حالت یاس میں ایمان قابل قبول سمجھتے ہیں اگر ایسا ہے تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ حالت یاس کا ایمان اجماعاً نا قابل قبول ہے یا پھر وہ فرعون پر حالت یاس کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ غرق کی حالت قطعاً یاس کی حالت ہے اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ ہاں غرق سے پہلے کے احوال کو یاس کے احوال میں شمار کرنا بہر حال مناسب نہ ہوگا لیکن جبکہ اجماع سے فرعون کا کفر ثابت ہو چکا تو ایسی حالت میں خواہ مخواہ یاس کی حالت سے اس کو نکالنے میں ابن عربی کو کوئی بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

(اور یہ بھی عجیب تضاد بیانی ہے) کہ خود ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں اسی فرعون کو شدید قسم کا کافر اور معاند بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جہنم کے بہت سے درکات ہیں جو اپنی ہولناکی کے اعتبار سے ایک دوسرے پر بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا طبقہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان متکبرین اور معاندین کیلئے مخصوص کیا ہے جو کفر و استکبار میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھے، جیسا کہ خود یہی فرعون اور اس جیسے دوسرے سرکش و معاند"۔
یہ ابن عربی کی وہ تصریحات ہیں جن کو اپنی تصنیف "فتوحات مکیہ" میں جا بجا پھیلاتے چلے گئے ہیں لیکن (خدا جانے کیا ہوا) کہ اس "نصوص الحکم" میں ان تمام تحقیقات کے بالکل ہی خلافت ایک عجیب بات کہہ ڈالی یعنی یہی کہ فرعون مومن تھا۔ ابن عربی کے بعض "ہواخواہوں" نے یہ بھی کہا کہ قرآن مجید کی اس آیت یعنی "حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انه الآیة" میں شیخ نے آیت میں جو متعدد احتمالات ہیں نصوص میں انہیں کا ذکر ہے۔ فرعون کے بارے میں ان کی ذاتی رائے وہی ہے جس کا کہ اظہار فتوحات مکیہ میں کیا تھا (یعنی فرعون کافر مجاہر ہے۔) واللہ اعلم

اور اگر تھوڑی دیر کیلئے یہ مان لیا جائے کہ ابن عربی کا مذہب یہی ہے کہ وہ فرعون کو مومن سمجھتے ہیں تو اجماع جو دلائل شرعیہ میں ایک نہایت ہی مضبوط دلیل ہے اس کے مقابلہ میں کوئی شخص شیخ کی تصریحات پر کیسے مطمئن ہو سکتا ہے۔ ابن عربی کی یہ اپج بڑی حیرت انگیز ہے۔ بس ان کی جلالت قدر کا تو یہی تقاضہ ہے کہ اغماض اور تغافل سے کام لیا جائے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ ان کی رائے کو اگر ہو سکے تو امت کی متفقہ

رائے سے قریب کیا جائے اور اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو بے تامل شیخ کی رائے کو چھوڑ دیا جائے، بعض علماء کی یہ کس قدر ناپسندیدہ بات ہے کہ باوجود یہ کہ شیخ کا قول امت کی اجماعی رائے کے مخالف ہے لیکن وہ امت کے اتفاقی فیصلہ کو پس پشت ڈال کر ابن عربی کی رائے کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ نعوذ باللہ من الخلل والزلل.

حالانکہ صاف بات تھی کہ عصمت صرف انبیاء ہی کی خصوصیت ہے، کسی دوسرے شخص کیلئے عصمت کا عقیدہ تراشنا سخت غلطی ہے۔ (ابن عربی تو بے چارے ابن عربی ہیں) ائمہ مذاہب جو دین کے مقتداء اور عالم کے راہنما ہیں ان سے بھی اجتہاد میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر اسی طرح ابن عربی کی اس رائے کو اجتہادی غلطی سمجھ لیا جائے تو کیا حرج تھا لیکن یا للعجب کہ بعض خوش قبول نے امت کی رائے کے مقابلہ میں شیخ کے تفرد کو صحیح سمجھا اور اسی پر یقین کر بیٹھے۔ ہم ان (جامد مقلدوں سے) دریافت کرتے ہیں اگر تمہارا خیال ہے کہ حق صرف شیخ ہی کے ساتھ ہے اور بقیہ امت حق پسندی کی راہ سے ہٹی ہوئی ہے تو اس پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اگر تم محض ابن عربی کی اتباع کرتے ہوئے ان کی رائے کی تصویب کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ایسے امور میں دور اول کے اہل فتویٰ کی اتباع ہی سب سے بہتر اور احتیاط سے قریب ہے اور اگر تم سمجھتے ہو کہ شیخ ارباب کشف میں سے ہیں اور سینکڑوں حقائق ودقائق معارف وعلوم انکی تصنیفات میں موجود ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں بلا کم وکاست آنحضور ﷺ کی مشکوٰۃ نبوت سے اخذ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان حقائق کے پیش نظر کسی مسئلہ شرعی میں ان سے غلطی کا امکان نہیں ہے۔ تو پھر ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ بات ہی دوسری ہے اور کشفیات میں کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ ٹھیک ہے ان کے علوم ومعارف کو کون ٹھکرا سکتا ہے اور جو کچھ ذوقیات کے سلسلہ میں وہ اپنی تصنیفات میں لکھ گئے ہیں سب قابل قدر اور گرانمایہ سرمایہ ہے لیکن اس کے باوجود فرعون کے ایمان کا مسئلہ یقیناً ایک فقہی مسئلہ ہے یہاں دلائل وبراہین سے گفتگو ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اجتہادی مسائل میں ایک انسان سے بہر حال سہو ونسیان کا امکان ہے۔ ہم کہہ آئے ہیں کہ عصمت صرف انبیاء ہی کا امتیاز اور

انہیں کی یہ خصوصیت ہے ''قدر مشترک'' نہیں جو انبیاء اور غیر انبیاء میں یکساں مشترک ہو۔

شیخ کا ایک اور تفرد: ابن عربی کا ایک اور تفرد ملاحظہ ہو۔ فتوحات مکیہ میں وہ لکھتے ہیں اور ان کے معتقدین اسکو نقل بھی کرتے ہیں کہ شیخ کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس سے عذاب دائمی کو کسی کیلئے بھی ثابت کیا جاسکے، شیخ کہتے ہیں کہ اگر بعض آیات ہیں بھی تو ''خلود نار'' کے سلسلہ میں ہیں اور ''دخول نار'' عذاب محض کو لازم نہیں لہٰذا دائمی طور پر جہنم میں رہتے سے، عذاب دائمی کا ثبوت مشکل ہے۔ حالانکہ ایک دو موقع پر نہیں بلکہ قرآن مجید میں جابجا، عذاب دائمی کی تصریحات ملتی ہیں، سورہ مائدہ میں ہے کہ وفی العذاب ھم خالدون.

سورہ فرقان میں ارشاد ہے کہ ''ویخلد فیہ مھانا'' فیہ کی ضمیر عذاب ہی کی طرف لوٹتی ہے جس کا کھلا مطلب یہی ہے کہ وہ عذاب میں دائمی طور پر رہیں گے۔ پھر سورۃ السجدہ میں فرمایا کہ ''وذوقوا عذاب الخلد'' سورۃ زخرف میں اعلان کیا گیا کہ:

ان المجرمین فی عذاب جھنم خالدون.

دیکھ لیجئے یہ مخصوص آیات ہیں اور پھر بھی ابن عربی کو عذاب دائمی تصریحات قرآن حکیم میں نہ مل سکیں۔

بہرحال ہم کو صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ عقائد، کفر و ایمان کے مسائل ہیں سواد اعظم کو نہ چھوڑنا چاہئے اور آداب مشائخ کے اتباع مناسب ہے اور مشائخ کے ساتھ حسن ظن رکھنا چاہئے اور تا بہ امکان ان کے تفردات کو اجتماعات سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے اور بات تو کام کی یہ ہے کہ آدمی مجاہدات و ریاضتوں پر لگ جائے اگر استعداد کامل ہے اور نیت بھی صادق تو کشف و یقین کی تجلیات خود بخود پر تو فگن ہوں گی اور خاص اس شبہ میں تقلید کی بڑی ضرورت ہے اور احتیاط رکھنے کا خاص اہتمام مطلوب ہے۔ واللہ الموفق وفقنا اللہ وایاکم لما یحب و یرضی.

ایک لطیف تحقیق: شیخ ابن حجر ہیثمیؒ نے اپنی تصنیف ''زواجر'' میں لکھا ہے کہ مجتہدین امت نے قرآن مجید کی اس آیت: ''فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا''

کے پیش نظر فرعون کے کفر پر اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ کم از کم اتنی بات تو ضرور ہے کہ اللہ پر ایمان اپنے زمانہ کے رسول و پیغمبر پر ایمان لائے بغیر کسی طرح بھی درست نہیں ہے، لہٰذا اگر آپ غور سے کام لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کھینچ تان کر کے فرعون کا ایمان زیادہ سے زیادہ آپ خدا پر دکھا دیں لیکن موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر فرعون ایمان لے آیا؟ اس کا کوئی ثبوت فراہم کرنا بے حد مشکل ہے قرآن کریم کی یہی آیت جس سے فرعون کا ایمان ثابت کیا جاتا ہے یعنی "حتیٰ اذا ادرکه الغرق الخ" فرعون کے رسول پر ایمان لانے کے سلسلہ میں قطعاً ساکت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی کافر ہزار بار چیخ چیخ کر کہے کہ "اشهد ان لا اله الا الله الذی امنت به المسلمون" تو بھی مسلمان اور مومن نہیں ہوسکتا۔ تاوقتیکہ آنحضور ﷺ کی رسالت پر کھلے طور پر ایمان نہ لے آئے، ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بالا تحقیق پر کسی کو یہ اشکال پیش آئے کہ فرعون کے ساحرین (جادوگروں) نے بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا ذکر نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ان کا ایمان معتبر سمجھا گیا (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول پر ایمان لانا چنداں ضروری نہیں ہے) اس اشکال کا حل یہ ہے کہ جادوگروں نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنے ایمان کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ "امنا برب العالمین رب موسیٰ و هارون" تو اس قول میں رب کا جو تعلق موسیٰ اور ہارون سے کیا گیا ہے اس کے تحت میں موسیٰ اور ہارون پر ایمان کا اعلان ہے اور فرعون کا یہ قول کہ "الذی امنت به بنو اسرائیل" میں موسیٰ و ہارون پر ایمان کا اظہار مفہوم نہیں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابل غور ہے کہ جادوگروں کا ایمان خدا اور موسیٰ کے معجزات پر ہے اور رسول کے کسی معجزہ پر ایمان لانا گویا کہ رسول پر ایمان لانا ہے۔ اس لئے موسیٰ پر ان کا ایمان بہر حال مفہوم ہوگا۔ بخلاف فرعون کے کہ اس کے قول میں موسیٰ پر ایمان نہ تو صراحتاً پایا جاتا ہے اور نہ اشارۃً کنایۃً مفہوم ہوتا ہے۔ بلکہ بنی اسرائیل کا ذکر کرنا اور موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکر سے گریز کرنا، اس بات کی صاف علامت ہے کہ فرعون اب بھی موسیٰ کا منکر ہے۔ ہاں بعض صوفیاء سے منقول ہے کہ ان کے خیال میں عذاب کے معائنہ کے وقت میں بھی

اگر ایمان لایا جائے تو بھی درست ہے شاید کوئی خوش فہم، صوفیاء کے اسی قول کو، فرعون کے ایمان کے سلسلہ میں بے تکلف استعمال کرے اور کہے کہ صوفیاء کے اس اختلاف کے باوجود حالت یاس میں ایمان کے قبول ہونے کا اجماعی فیصلہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو صوفیاء کی طرف اس قول کی نسبت ہی زیادہ صحیح نہیں ہے اور اگر تھوڑی دیر کیلئے یہ تسلیم کرلیا بھی جائے کہ صوفیاء نے کوئی ایسی بات کہی ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ اجماع کے انعقاد اور اس کی مخالفت کے سلسلہ میں صرف اہل اجتہاد کی مخالفت اور حمایت معتبر ہوسکتی ہے صوفیاء کا اختلات اجماع کو شکست و ریخت کرنے کی صلاحیت وطاقت نہیں رکھتا ہے اور آپ کو یہ بھی تو بہر حال سامنے رکھنا ہوگا کہ ہم فرعون کے کفر کا فیصلہ صرف اسی وجہ سے نہیں کرتے کہ حالت یاس میں ایمان معتبر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ فرعون کو کافر کہنے کیلئے ہماری یہ بھی ایک دلیل ہے کہ وہ موسیٰ پر ایمان نہیں لایا اور خدا پر ایمان، رسول پر ایمان لائے بغیر ہرگز درست نہیں ہے۔

ابن عربی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اضطرار میں بھی ایمان کو معتبر مانتے ہیں اور فرعون کے ایمان کے قائل ہیں ہمارے خیال میں اس قسم کی کوئی تحقیق ابن عربی سے نقل نہیں ہے اور پھر یہ تو کھلی بات ہے کہ عصمت صرف انبیاء ہی کا خاصہ ہے باقی ہر فرد بشر، نسیان وخطا کا پتلا ہے۔ اگر ابن عربی سے اجتہادی غلطی ہوگئی تو اسے اتنی اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ آیات قرآن، احادیث کے مقابلہ میں ابن عربی ہوں یا کوئی اور کسی کی کوئی بات شنوا نہیں ہوسکتی ہے، صحابہ نے قرآن کی جو تفسیر کی، تابعین اور مجتہدین نے جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حالت خوف وشدت" میں ایمان لانا مفید نہیں ہے اور اس سے یہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ فرعون کا ایمان بھی قبول نہیں ہے اور اگر حالت یاس میں ایمان درست مان بھی لیا جائے تو پھر بھی کچھ اسباب وعلل کی بنا پر فرعون کا ایمان معتبر نہ ہوگا جیسا کہ ہم تفصیل سے لکھ آئے ہیں۔

شیخ ابن حجرؒ نے زواجر میں جو کچھ لکھا تھا یہاں تک اس کا ترجمہ اختصار کے ساتھ نظر قارئین کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم وھو الہادی

گناہ کبیرہ سے ایمان ختم نہیں ہوتا: سابقہ بحثوں کے نتیجہ میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ ہاں اعمال ایمان کامل کے اجزاء میں سے ہیں۔ لیکن بے عملی اور بدعملی کے باوجود مومن ضرور باقی رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ایمان ناقص ہو لیکن نقص ایک صفت ہے۔ کسی شے کو حقیقت سے نکالنے میں نقص کو کوئی دخل نہیں ہے۔

بہر حال کہنا ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے مومن کمال کی صفت کو کھو بیٹھتا ہے لیکن ایمان اس کے پاس اس وقت بھی موجود رہتا ہے۔ بدعملی مومن کو کافر نہیں کرتی۔ ہاں بدعمل کے فاسق اور عاصی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس طرح مومن کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تو وہ جو ایمان کے ساتھ اعمال حسنہ کا طویل دفتر بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مومن کامل ہیں اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو ایمان اور اس کے ساتھ بدعملی کا شکار ہوئے ہیں یہ مومن عاصی کہلائے جائیں گے۔ ان دونوں جماعتوں کو مومن ہی کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا اور مسلمانوں کے احکام ان پر جاری کئے جائیں گے۔ قرآن کریم اور احادیث میں فساق و فاجر پر اسلام کے احکام کا نفاذ ہر حال میں کیا گیا ہے۔ خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فاسقوں اور گنہگاروں کے جنازوں پر نماز پڑھی ہے۔ مسلمانوں کے قبرستانوں میں سپرد خاک کیا اور ان کیلئے دعا و استغفار کی ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر، عاصی و سرکش، ان کے نزدیک ایمان و اسلام سے خارج نہیں تھے۔

چھوٹے اور بڑے گناہ: آپ کو معلوم ہے کہ گناہوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک چھوٹے گناہ اور دوسرے بڑے بڑے گناہ، گناہ کبیرہ یہ ہے کہ اس کا گناہ ہونا دلیل قطعی سے معلوم ہو چکا ہو اور خاص اس کے سلسلہ میں کوئی وعید شارع نے پیش کی ہو، جیسا کہ:

۱۔ ناحق کسی کو قتل کرنا،

۲۔ زنا کرنا،

۳۔ لواطت کرنا،

۴۔ کسی نیک اور پاک دامن عورت کو جو نکاح بھی کر چکی ہے بلا وجہ زنا کی تہمت سے متہم کرنا،

۵۔ جنگ کے موقع پر کفار اگر مسلمانوں سے دوگنے ہوں پھر ان کے مقابلہ میں فرار اختیار کرنا،

۶۔ جادو کرنا،

۷۔ یتیم کا مال ناحق ہڑپ کر لینا،

۸۔ اپنے مسلمان ماں اور باپ کو ناحق ستانا،

۹۔ حرم مکہ کی حدود میں ان کاموں کا کرنا جن کی وہاں ممانعت ہے،

۱۰۔ سود کھانا،

۱۱۔ چوری کرنا،

۱۲۔ شراب اور باقی نشہ کی چیزوں کا استعمال کرنا،

۱۳۔ خنزیر کے گوشت کا استعمال کرنا،

۱۴۔ جھوٹی گواہی دینا،

۱۵۔ اور بلا عذر کتمانِ شہادت کرنا،

۱۶۔ کسی عذر شرعی کے بغیر رمضان کے فرض روزے نہ رکھنا،

۱۷۔ ترک نماز،

۱۸۔ نماز کو وقت پر نہ پڑھنا،

۱۹۔ زکوٰۃ نہ دینا،

۲۰۔ جھوٹی قسم کھانا،

۲۱۔ صلہ رحمی نہ کرنا،

۲۲۔ ناپ و تول میں خیانت کرنا،

۲۳۔ مسلمانوں سے بلا وجہ لڑنا جھگڑنا،

۲۴۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کو برا بھلا کہنا،

۲۵۔ رشوت لینا،

۲۶۔ چغل خوری کرنا،

۲۷۔ امر بالمعروف اور نہیں عن المنکر، اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روکنا، باوجود قدرت کے چھوڑنا،

۲۸۔ پڑھنے پڑھانے کے بعد قرآن مجید کو بھلا دینا،

۲۹۔ کسی جاندار کو آگ میں جلانا،

۳۰۔ اور عورت کا اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا

۳۱۔ اور مرد کا عورت پر ظلم کرنا،

۳۲۔ میاں بیوی کے درمیان بدمزگی اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کرنا،

۳۳۔ اہل علم اور حفاظ کی توہین کرنا،

۳۴۔ خدا کی مغفرت سے ناامید ہونا اور اس کے عذاب سے بے خوف ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کے سب گناہ کبیرہ ہے۔

کبائر کی یہ تفصیل مولانا جلیل الدین دوانی نے بعض روایت سے جو امام شافعی کے تلامذہ سے منقول ہیں سامنے رکھ کر پیش کی ہے لیکن بعض علماء نے کبائر کی فہرست میں کچھ اور گناہوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ضابطہ جس سے آپ بھی کبیرہ اور صغیرہ کو معلوم کر سکیں گے یہ ہے کہ اگر کسی گناہ پر شارع نے وعید کی ہے اور اس کا کبیرہ ہونا قطعیت کے ساتھ معلوم ہے تو وہ کبیرہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ صغیرہ ہوگا۔ صغیرہ کی تفصیلات اور ان کی فہرست مرتب کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے گناہ تو اس قدر ہیں کہ ان سے محفوظ رہنا بہت ناممکن ہے اور تو اور تقویٰ کیلئے چھوٹے گناہوں سے بچنا ضروری نہیں ہے بشرطیکہ معمولی گناہوں پر اصرار نہ ہو۔ اگر صغائر پر اصرار ہوگا تو یہ بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے۔ ہاں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ کبیرہ کا مرتکب اگرچہ ضعف ایمان میں مبتلا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں سمجھا جائے گا، لیکن فرقہ خوارج کبیرہ کے مرتکب بلکہ معمولی گناہ کرنے والے کو بھی اسلام سے

خارج سمجھتے ہیں۔ یہ مذہب بالکل باطل ہے اسی طرح معتزلہ کہتے ہیں کہ فاسق نہ مسلمان رہا نہ کافر ہوا۔ یہی وہ سب سے پہلا اختلاف ہے جو اسلام میں رونما ہوا ہے اور معتزلہ ہی وہ سب سے پہلی جماعت ہے جس نے اسلام کے مضبوط قلعہ میں شگاف ڈالنے کا مذموم کام سرانجام دیا اور عقل و ہوا کی پیروی کی ہے۔ اپنی اس اپج کو صحیح ثابت کرنے کیلئے نصوص میں خواہ مخواہ ان کو تاویلات کرنا پڑیں حالانکہ خداوند کریم نے اپنے بندوں کو خود دو جماعتوں پر تقسیم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

هو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن (القرآن الحکیم)

''وہی ہے خدا جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم یا مومن ہو یا کافر۔''

اس کے علاوہ تیسری اور کوئی جماعت نہیں ہے سچی بات یہ ہے کہ معتزلہ نے آنحضور ﷺ کے مقام کو پہچانا نہیں ہے کہ آپ کی نورانیت کے مقابلہ میں کوئی گناہ بھی حیثیت نہیں رکھتا، جس طرح اچھے کام کفر کے ہوتے ہوئے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ اسی طرح گندے اعمال ایمان پر کبھی بھی غالب نہیں آسکتے ہیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص حلال کو حرام یا حرام کو حلال سمجھنے لگے یا گناہ کو برا کام نہ سمجھتا ہو سو یہ تو خود کفر ہے اور تصدیق قلبی کے بالکل خلاف ہے۔

لیکن اگر حرام کو حرام سمجھتا ہے گناہ کے گناہ ہونے کا قائل ہے، لیکن بشریت یا شہوت کے غلبہ سے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اس سے کافر ہرگز نہ ہوگا کیونکہ تصدیق قلبی جو ایمانی دولت ہے اُس سے اس کا کوئی تصادم نہیں ہے۔ اس کا قلب ایمان لا چکا ہے اور اس کے دل میں ایمان کی نورانیت جگہ پا چکی ہے لیکن اس کے اعضاء و جوارح اس کے دل کے تابع نہیں ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس وقت وہ گناہ بتقاضائے بشریت کرتا ہے عین انہیں اوقات میں اللہ کے عذاب کا خوف، مغفرت کی امید، توبہ کا ارادہ اس کے قلب و دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا ان تمام باتوں کے باوجود کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے وہ دائرہ ایمان ہی سے معاذ اللہ خارج ہو گیا۔

گناہ اور قلب کی سیاہی: لیکن یہ جو کہا گیا ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب کے باوجود مومن ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہے۔ مسلمان کو اس سے قطعاً دھوکہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور یہ سن کر گناہوں پر جسارت کرنا، خدا کی نافرمانی کی جرات، انسانیت نہیں ہے بلکہ حیوانیت ہے) یاد رکھنا چاہئے کہ گناہ کی نحوست، قلب کی صفائی اور ایمان کی تازگی کو ختم کر ڈالتی ہے۔ قلب سیاہ ہو جاتا ہے لطافت کے بجائے، قساوت پیدا ہوتی ہے۔ گناہ گار جب گناہ کرتا ہے تو کفر سے قریب ہو جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ گناہوں میں منہمک ہو گیا تو کفر کی موجِ خوں میں مبتلا ہونا کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ احادیث میں ہے کہ انسان جب گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر فوراً توبہ کر لیتا ہے تو یہ نقطہ دور ہو جاتا ہے اور دل اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتا ہے اور اگر توبہ نہ کی تو یہ سیاہی پھیل جاتی ہے اور تمام دل پر چھا جاتی ہے۔ پھر اگر گناہوں کی ظلمت نہان خانہ دل پر برابر پڑتی رہی گناہوں میں انہماک بڑھتا چلا گیا تو یہ سیاہی قلب پر پوری طرح محیط ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ایمان کے قبول کرنے کی صلاحیت حق بات کو سننے کی استعداد بھی فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو قرآن حکیم، ختم اور طبع کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے:۔

"کلا بل ران علیٰ قلوبھم"۔ "کوئی نہیں پھر زنگ پکڑ گیا ان کے دلوں پر"۔

"وطبع اللہ علیٰ قلوبھم"۔ "اللہ نے مہر لگا دی ان کے قلوب پر"۔

"وختم اللہ علیٰ قلوبھم"۔ "مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر"۔

ان آیات میں اسی کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس لئے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اگرچہ معصیت کی وجہ سے مومن ایمان سے خارج نہیں ہوتا، تاہم اس کا شدید خطرہ ہے کہ بتدریج وہ کفر کی طرف جھک جائے اور خدانخواستہ کفر کی آلودگیوں میں مبتلا ہو جائے۔ بس سلامتی اسی میں ہے کہ آپ ایمان کی حد سے باہر نہ نکلیں اور کفر کی حدود میں داخل نہ ہوں اور پوری طرح اعتدال کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ بلکہ بڑی حد تک اس بات کی سعی ہو کہ مباحات میں بھی کم سے کم حصہ اپنے لئے خاص کریں اس سے زیادہ

نہیں صرف یہ تین چیزیں انسان کیلئے ہر طرح کافی ہیں۔

۱۔ قلیل مقدار میں کھانا جو سد جوع کا باعث ہو،

۲۔ اتنا کپڑا جس سے ستر ہو سکے،

۳۔ ایک چھوٹا سا مکان جس میں گرمی اور سردی سے آدمی پناہ لے سکے،

اور بس ضرورت سے زیادہ لینا، مباحات کے استعمال کا دروازہ کھولتا ہے۔ پھر مباحات میں انہماک مکروہات اور مشتبہات میں لے جاڈالتا ہے اور یقیناً مشتبہات حرام اشیاء کے استعمال کا بھی راستہ دکھلاتے ہیں۔ یہاں آکر اسلام کی حد ختم ہو جاتی ہے اور کفر کی حدود کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ **نعوذ باللہ من ذلک۔**

حاصل کلام یہ ہے کہ کمال اور انحطاط کی طرف نکلنے کے بس یہی دو راستے ہیں اگر آپ ایمان لے آئیں، فرائض، واجبات اور سنن و نوافل کا اہتمام رکھیں، اعمال میں استقامت ملحوظ ہو تو یہ سب کچھ ترقی کے راستے ہیں اور مباح و مکروہ حرام و کفر یہ تنزل کے تاریک گڑھے ہیں جن میں آپ پڑ کر گرتے چلے جائیں گے، عافیت اور نجات اسی میں ہے کہ بندہ خوف و رجا کے درمیان ان دو کیفیتوں سے کبھی باہر نہ ہو۔ واللہ الهادی۔

مومن ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا: جیسا کہ تفصیل سے آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ مومن کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہ پہلے سے آپ کو معلوم ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث سے جہنم میں دائمی طور پر رہنے کا معاملہ صرف کفار ہی کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ بھی آپ کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں ہرگز نہ رہے گا۔ اگرچہ توبہ کے بغیر اس دنیا سے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی صوابدید کے مطابق کچھ ایام یا کچھ عرصہ اس کو جہنم میں رکھے گا اور سزا دے کر پاک کر کے پھر بہشت میں داخل کر دے گا۔ اب یہ بہشت میں دائمی طور پر رہے گا۔ امام حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں ابو ہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خداوند کریم بعض مومن گناہگاروں کو جہنم میں ایک گھڑی سے زیادہ نہ

رکھیں گے۔ بعض کچھ ایام رہیں گے۔ بعض مہینہ اور بعض سال بھر، سب سے بڑی وہ مدت جس میں بعض گناہ گار جہنم میں رہیں گے۔ دنیا کی مدت کے برابر ہوگی اور دنیا کی مدت جیسا کہ معلوم ہے سات ہزار سال ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

ابن حاتم اور ابن شاہین نے اس قسم کی روایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی نقل کی ہے۔

شرک ہرگز معاف نہ ہوگا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کفر وشرک ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ باقی تمام چھوٹے بڑے گناہ اس کی مشیت پر موقوف ہیں۔ چاہے تو تمام توبہ یا بغیر توبہ کے معاف کردے اور اگر مواخذہ کرنا چاہے تو بھی کرسکتا ہے۔ "یفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید"

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ انسانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک مومن اور دوسری کافر، پھر مومن کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک مطیع وفرمانبردار اور دوسری جماعت عاصی ونافرمان کی ہے۔ پھر عاصی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کو گناہوں کے بعد توبہ کی توفیق ہوئی ہے اور دوسرے وہ جن کو توبہ کی توفیق نہ ہوئی پس کافر تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور مومن مطیع ومومن تائب بالاتفاق بہشت میں رہیں گے اور رہا وہ مومن عاصی جس نے توبہ نہیں کی سو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگر چاہے گا تو معصیت کے مطابق سزا دے کر جہنم سے نکالے گا اور اگر مشیت ہوگی تو بغیر عذاب دے کسی کی شفاعت سے یا شفاعت کے بغیر ہی بہشت میں بھیج دے گا۔ یعذب من یشاء ویغفر لمن یشاء۔

گناہ گاروں کی مغفرت کے سلسلہ میں کثرت سے احادیث وآیات ملتی ہیں۔ ایک حدیث تو وہی تھی جس کو ہم نے وہاں ذکر کیا تھا جہاں سوال واعمال کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ دوسری حدیث یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بندہ کو اپنے سامنے کھڑا کریں گے اور اس کو نامہ اعمال پر مطلع فرمائیں گے۔ یہ بندہ دیکھے گا کہ اس نامہء اعمال میں سوائے سیئات اور گناہوں کے کچھ بھی نہیں ہے، نامہء اعمال کا وہ رخ جو مخلوق کے سامنے ہوگا

اس پر اچھے اعمال لکھ دیئے جائیں گے۔ اس اہتمام کے نتیجہ میں مخلوق صرف اس کے حسنات ہی جان سکے گی۔ اس کی برائیاں اور بداعمالیاں خلق خدا کے سامنے نہ ہوں گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس بندہ سے فرمائیں گے کہ اے مومن ہم نے ہمیشہ دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی ہے۔ آج بھی پردہ داری سے کام لیتے ہیں۔ چل بہشت کی جانب قدم بڑھا اور بے فکر ہو کر ہمیشہ کیلئے وہاں قیام کر۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوگا اس خدائے قدیر وقادر کا حکم ہوگا۔ عقل کی موشگافیاں ان معاملات میں مناسب نہیں ہیں کہ آپ کہنے لگیں کہ کفر کو کیوں نہیں بخشے گا اور فلاں کی مغفرت کیوں ہوگی اور فلاں کو کیوں پکڑ لیا؟ يفعل الله ما يشاء ويحكم ما يريد.

وعدہ اور وعید: ان احادیث سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ میں کبھی خلاف نہ کریں گے۔ ہاں وعید (ڈانٹ ڈپٹ) میں اپنے فرمانے کے مطابق معاملہ نہ کریں یہ ممکن ہے کریم لوگوں کی عادت یہی ہوتی ہے کہ اگر وعدہ کر لیتے ہیں تو پھر ایفائے عہد ضروری سمجھتے ہیں، مشہور مقولہ ہے کہ "الکریم اذا وعد وفی" یعنی کریم جب وعدہ کرتا ہے تو اسے ضرور پورا کرتا ہے اور اگر اپنے قہر وعذاب سے ڈراتے ہیں تو ضروری نہیں کہ واقعی قہر وعذاب کو واقع بھی کریں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ اور وعید دونوں میں خلاف نہ کریں گے اور اگر خلاف کریں گے تو اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی دی ہوئی خبریں بھی غلط ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ خدا کی خبروں میں کذب بیانی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وعید سے متعلق تمام خبروں میں بتقاضائے کرم مشیت شرط تھی۔ اگرچہ اس مشیت کے شرط ہونے کی صراحت نہیں کی گئی تھی۔ تاہم یہ ملحوظ ضرور تھی اور رہیں وہ خبریں جو وعدہ سے تعلق رکھتی ہیں وہ حتمی طور پر پوری کی جائیں گی۔ آیات واحادیث کا وہ ذخیرہ جن میں مشیت کے واقع ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ ہماری اس تحقیق کی اصابت پر دلیل ہیں اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وعید سے متعلق خبروں میں صرف عذاب کے مستحق ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ بالفعل عذاب کا واقع ہونا ضروری نہیں ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ وعید کی انشاء ہے خبر نہیں

ہے۔ بہر حال کچھ بھی کہیے مقصد تو یہ ہے کہ خدا کی اخبار میں کذب بیانی کا جو احتمال پیدا کیا جا رہا ہے وہ درست نہیں ہے۔

چھوٹے چھوٹے گناہ اور عذاب: جبکہ یہ حقیقت سامنے آ چکی کہ کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں کا معاملہ مشیت الٰہی پر موقوف ہے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے گناہوں پر بھی عذاب میں مبتلا کر دے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی بہر حال گناہ تو ہیں ان کے گناہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور گناہ پر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا خدا کا عذاب و عقاب ممکن ہے اس لئے صغیرہ پر بھی عقاب و عذاب ہو سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ شہاب الدین احمد بن الحجر المکی الہیثمی مکہ معظمہ کے شیخ الاسلام اور فقہ و حدیث میں زبردست ماہر تھے۔ علماء نے فقہ میں ابن حجر عسقلانیؒ سے ان کو فائق قرار دیا ہے شمائل ترمذی لا اربعین اور مشکوٰۃ شریف کی بڑی کامیاب شرح لکھی ہیں۔ "زواجر" کبیرہ گناہوں کے بیان میں ان کی مفید تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ اور متعدد تصانیف ان کے قلم سے تیار ہوئی ہیں۔ شافعیت میں شدید تعصب اور تصلب کے باوجود امام اعظم کی منقبت میں ایک رسالہ "قلائد العقیان فی مناقب النعمان" کے نام سے لکھا ہے شیخ علی متقی جب مکہ میں پہنچے تو انہوں نے انہیں ابن حجر سے پڑھنا شروع کیا لیکن اپنی ذہانت اور منفرد کمالات کی بناء پر آخر میں استاذ ہی کو اپنا شاگرد بنا لیا۔ ابن حجر کی وفات ۹۷۵ھ میں ہوئی۔

۲۔ آپ کا نام محمد، جلال الدین لقب ہے، اور والد کا نام سعد الدین اسعد ولادت صوبہ شیراز کے ضلع کازرون کے مضافات میں "دوان" نام کے ایک گاؤں میں ہوئی، سال ولادت ۸۳۰ھ ہے، وفات ۹۱۸ھ اور بعض نے ۹۰۸ھ لکھی ہے۔

۳۔ (ابو عبداللہ محمد بن علی ملقب بحکیم ترمذی، طبقہ صوفیاء کی ایک مشہور و معروف شخصیت، سنن ترمذی والے ترمذی ان کے علاوہ ہیں۔ ان حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور تالیف ہے لیکن غلط روایات کا ایک طومار ہے جس کو حکیم ترمذی کے قلم نے تیار کیا ہے۔ کام کی چیزیں لے کر بقیہ باتیں چھوڑ دینے کی ضرورت ہے۔ خود کہا کرتے تھے کہ میں تصنیف نہیں کرتا بلکہ جب قبض کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو دل بہلانے کیلئے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے لکھ ڈالتا ہوں۔ ۲۵۵ھ میں جام شہادت نوش کیا۔

۴۔ عبدالرحمٰن بن محمد ابو حاتم التمیمی صاحب مسند ہیں اور ایک ضخیم تفسیر بھی لکھی ہے ابو علی خلیلی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ابدال تھے۔ ۳۲۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۵۔ ابن شاہین مشہور محدث ہیں ان کی مسند اہل علم میں مقبول و متداول ہے۔

بعثت انبیاء

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی واجب نہیں نہ اضطراراً کیونکہ وہ مختار ہے جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے۔ نہ یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ عقل کے فیصلے کسی چیز کے کرنے پر اس کو مجبور کر دیں۔ کیونکہ عقل خدا کی محکوم ہے خدا پر حاکم نہیں ہے۔ بہرحال اضطراراً و ازروئے عقل اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا کرنا یا نہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں محض اپنے فضل وکرم سے کام لیتے ہوئے بعض ایسی چیزیں جو عالم کے بقاء انسانیت کے کمال، معاش ومعاد کی بہترائی کیلئے مفید ہوں مثلاً رزق کا انتظام واہتمام، بندوں کی ہدایت کیلئے پیغمبروں کا بھیجنا وغیرہ کو خدا نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس کو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ چیزیں خدا پر واجب وضروری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہیے کہ ایک سنت وعادت کا اجراء ہے جس کو وہ اپنے فضل عام سے کرتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابل غور ہے کہ عام انسان براہ راست جناب قدس سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت واستعداد نہیں رکھتے ہیں۔ اس لئے کچھ خاص بندوں کو منتخب کر کے ان کو علم ذات وصفات دیا۔ اپنے افعال کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں اور وہ علوم بھی سکھلائیں جن میں عام انسانوں کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کے سامان ہوں اور پھر مخلوق کی جانب بھیج دیا۔ یہ مقدس طائفہ لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے جن چیزوں کی دنیا وآخرت میں جاننے کی ضرورت ہوتی ہے اس سے ان کو واقف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انبیاء کی ضرورت یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہشت وجہنم کو پیدا کیا ہے۔ بہشت نیکو کاروں کا مقام ہے جہنم سیاہ کاروں کا ٹھکانہ ہے۔ وہ کیا اعمال ہیں جن کے کرنے سے آپ بہشت میں جائیں۔ جہنم کا کندہ ثابت نہ ہوں۔ ان کا کسی کو علم نہ تھا اور عقل سے ان کو معلوم کرنا

ممکن بھی نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسول بھیجے تا کہ وہ مخلوق کو سمجھائیں۔ جنت میں لے جانے والے اعمال کی تلقین کریں اور جہنم میں جانے سے روکنے کی کوشش کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اب مخلوق کو خدا کے سامنے کوئی بھی عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہے گا۔ اگر انبیاء نہ آتے تو یوم حساب میں کہہ سکتے تھے کہ اے خدا ہمارے پاس تو کوئی ایسا نہ آیا جو ہم کو کچھ بتاتا، سکھاتا، اب تو بلا وجہ ہم پر عذاب کیوں کر رہا ہے لیکن جب انبیاء نے آ کر حق اور باطل دکھا دیا تو عام انسانوں کی عذر تراشیوں کے دروازے بند ہو گئے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

لئلایکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل.

تا کہ رسولوں کے بعد اللہ کے مقابل میں عام انسانوں کیلئے حجت باقی نہ رہے۔

اور اسی طرح یہ بھی ارشاد ہے کہ:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ.

''ہم نے آپ کو رحمت مجسم بنا کر مخلوق کی جانب بھیجا ہے''۔ (القرآن حکیم)

اور حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم سماوی وارضی کے اصول اور علمی و عملی کمالات، حضرات انبیاء ہی کی وساطت سے مخلوق تک پہنچے ہیں۔ علوم واخبار کا سرچشمہ سوائے وحی آسمانی کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔ علماء و حکماء اسی سرچشمہ سے سیراب ہوتے ہیں اور ان کی تمام علمی موشگافیوں کا مخزن یہی آسمانی وحی کا پاکیزہ ذخیرہ ہے۔ ہاں قیاس و اجتہاد، علمی ریاضت اور جدوجہد کی وجہ سے کچھ چیزوں کا ضرور اضافہ کیا گیا ہے لیکن آپ علماء و حکماء کی اس تمام جدوجہد کو، وحی آسمانی کی زیادہ سے زیادہ تفسیر و تشریح کہہ سکتے ہیں۔ غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کی بعض کاوشیں جو شریعت سماوی کی مخالفت نظر آتی ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضہ یہ ہوا کہ کسی شریعت کو منسوخ اور دین کو تبدیل کر دیا جائے تو عین اس وقت میں کج دماغوں کی ایک جماعت، سابق شریعت پر قائم رہی اور انبیاء کی اتباع سے پوری قوت کے ساتھ انحراف کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری جماعت اٹھی اور اس نے تحریف وتصحیف کر

کے اس سابق شریعت کا چہرہ مسخ کر دیا اور بدقسمتی سے ایک جماعت ایسی بھی موجود رہی جس نے صرف عقل کی رہنمائی میں اپنے اوہام خیالات کا وحی سے پیوند لگا کر قیل وقال کے دروازے کو کھول دیا ہے۔ بہرحال یہی کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے علوم اور آسمانی وحی میں اختلاف نظر آتا ہے۔ ہم نے ان اسباب کی تشریح اس لئے ضروری سمجھی تاکہ ناظرین کو ہمارے اس دعوے میں کہ تمام علوم کا سرچشمہ وحی آسمانی ہے۔ کوئی تامل نہ ہو ورنہ بظاہر علوم اور وحی کا یہ کھلا اختلاف دیکھ کر اس قسم کا تردد وخلجان ضرور پیدا ہوسکتا ہے اور یہ سمجھنا تو بالکل ہی غلط ہوگا کہ حکماء وعقلاء نے اپنی دماغی صلاحیتوں کے زور پر مشائخ واساتذہ سے جو کہ اخبار النبیؐ کے راوی اور ناقل ہیں اعراض کرتے ہوئے ان علوم کا ذخیرہ بہم پہنچایا ہے۔ کیونکہ یہ طے شدہ حقیقت ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ علوم کے حاصل کرنے کا طریقہ سوائے تعلم (سیکھنے) کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہاں پھر اپنا اپنا فہم واستنباط ہے جس سے علوم وکمالات میں ترقی کی راہیں اپنے لئے کھولی جاسکتی ہیں۔ حدیث میں بھی ہے کہ علوم کو حاصل کرنے اور پاکیزہ اخلاق کو سیکھنے کا ذریعہ صرف تعلیم ہی ہے۔ بہرحال اس مختصر بحث کے نتیجہ میں انبیاء ورسل کی ضرورت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اس لئے ہم دوسری بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

معجزات: معجزات پر تفصیلی گفتگو شروع کرنے سے پہلے اتنی بات ہم آپ کو سمجھا دینا چاہتے ہیں کہ ہر دعویٰ کیلئے دلیل کی ضرورت ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت وسفارت کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو بھی اپنے دعوے کی تصدیق وتائید کیلئے کسی دلیل وبرہان کی ضرورت پیش آتی تھی۔ وہ اپنے دعوے پر جو دلیل مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں، اصطلاح علماء میں اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ ہماری اس تمہید سے معجزہ کی ایک اجمالی حیثیت آپ کے سامنے آگئی ہوگی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے معجزہ اصل میں خرق عادت ہے۔ جو کسی مدعی نبوت کے ہاتھ پر اس کے دعویٰ کے مطابق ظاہر ہوتا ہے دوسرے لوگ اس کا مثل پیش کرنے سے عاجز وقاصر ہوتے ہیں اور خرق عادت کا مطلب یہ ہے کہ حکیم مطلق یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام امور

کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اب کوئی امر اس عالم اسباب میں اپنے سبب کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی کو عادت کہتے ہیں لیکن کبھی اللہ تعالیٰ اس عام عادت کے خلاف بھی عمل کرتا ہے اور کوئی خاص چیز اپنے سبب کے بغیر نبی و رسول کے ہاتھ پر واقع ہوتی ہے، مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ خلاف عادت فعل جب رسول کے ہاتھوں پر ظاہر ہوگا تو یہ اس کے نبی ہونے کی کھلی علامت سمجھی جائے گی۔

اس طرح معجزہ ہمیشہ خدا کا فعل ہو سکتا ہے کسی انسان کا نہیں۔ کیونکہ اسباب کے بغیر کسی شئے کو وجود میں لے آنا انسانوں کی قدرت سے باہر کی چیز ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ معجزہ نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے اور معجزہ کو دیکھنے کے بعد بے اختیار نبی کی صداقت کا یقین ہوتا ہے اور نفس انسانی اس کی تصدیق پر خود کو مجبور پاتا ہے، اب نفس انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔ ہم نے یہاں جو کچھ کہا ہے نفس انسانی کی فطرت اور جبلت کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔

(فطرت انسانی سے فطرتِ سلیم مراد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور جن معاندین نے معجزات کو دیکھنے کے بعد بھی نبی کو ماننے سے انکار کر دیا وہ فطرت سلیم سے گویا کہ ہٹ چکے ہیں۔ ''انظر کشمیری'')

ہمارے خیال میں یہ تو آپ کو بتانے کی ضرورت ہے نہیں کہ) دعویٰ کی اہمیت کے پیش نظر دلیل بھی مہتم بالشان ہونا چاہئے۔ کیونکہ معجزہ کا تمام تر تعلق عالم قہر و قدرت سے ہے۔ اس کا غلبہ و سطوت اس قدر شدید ہے کہ پائے ثبات کی کیا مجال کہ وہاں استقامت کے دعوے کرے یا اختیار کی باگ اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بلا شبہ نہ استقامت رہ سکتی اور نہ اختیار قائم رہ سکتا ہے اور رہیں دلائل عقلی، سو ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ کچھ عقدے ہیں جن کو خیال و اوہام کے (دھاگہ) میں ڈال دیئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عقلی موشگافیوں سے سے کسی شخص کو خاموش کرنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے اور عقل کی تمام توانائیوں کو صرف کرنے کے باوجود قیل و قال کا دروازہ بدستور کھلا رہتا ہے۔

کلامیات اور فلسفہ کی بحثوں کا اثر آپ جائزہ لیں تو ہمارے بیان کی تصدیق آپ بھی

کریں گے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی جو شخص کفر پر اصرار کرے تو اب اس کے کفر کا منشاء سوائے عناد اور شقاوت کے کچھ اور نہیں ہے۔

اول الانبیاء و خاتم النبیین: سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین.

''یعنی آپ ﷺ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں''

آپ کی بعثت سے دین کی تکمیل اور مکارم اخلاق کو پورا کرنا مقصود تھا جبکہ یہ مقصد کامل طور پر حاصل ہوگیا ہے تو اب کسی دوسرے پیغمبر کی ضرورت نہ ہوگی اور علماء و خلفاء جو آپ کی شریعت کے حامل اور آپ کی تعلیمات کے ترجمان ہیں ان کے وجود سے دین و شریعت کی ترجمانی ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

بہر حال ان اسباب و وجوہ کی بنا پر آپ کے بعد کسی اور نبی یا رسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

انبیاء کی تعداد: ہاں یہ بھی ایک سوال ہے کہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں کی تعداد کیا ہے جو نبی و رسول کی حیثیت سے مخلوق کی جانب بھیجے گئے ہیں۔ باوجود یہ کہ بعض احادیث میں ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں لیکن پھر بھی بہتر اور مناسب یہی ہے کہ انبیاء کی تعداد متعین نہ کی جائے کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ:

منهم من قصصنا علیک و منهم من لم نقصص علیک.

''ہم نے بعض انبیاء کی داستاں آپ کو سنائی اور بہت سوں کے قصے آپ کو سنائے نہیں گئے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی بڑی طویل فہرست ہے جس کے بعض اجزاء انسانوں کے علم و معلومات میں نہیں ہیں۔ بعض علماء کو اس موقع پر یہ قوی اشکال

پیش آیا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کا علم کسی کو نہیں ہے اور جن احادیث میں تعداد متعین کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی تعداد آپ کو معلوم ہے۔ اس اشکال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جبکہ آپ کو انبیاء کی تعداد نہیں بتائی گئی تھی اور جب بتا دی گئی تو آپ نے صحابہؓ کے سامنے اس کا اظہار کر دیا ہے۔ اگرچہ بعد میں قرآن کریم میں اس تعداد کو ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا لیکن اس تمام بحث کے باوجود ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ انبیاء کی تعداد کی تعیین کے سلسلے میں خاموش ہی رہنا بہتر ہے کیونکہ انبیاء کی تعداد کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

ذوالقرنین: ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ذوالقرنین کیا تھے؟ بعض کی رائے ہے کہ وہ پیغمبر تھے اور اکثر محققین کا خیال ہے کہ ذوالقرنین ایک انصاف پسند بادشاہ تھے۔ ہمارا بھی رجحان یہی ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ ہی تھے، پیغمبر نہ تھے اور جناب علی کرم اللہ وجہہ سے بھی یہ منقول ہے۔ بعض لوگوں کی یہ بھی رائے ہے کہ ذوالقرنین فرشتہ تھے، یہ بات تو بڑی کمزور اور اس کو دل قطعاً قبول نہیں کرتا نبوت کی طرح ذوالقرنین کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ مشہور تو یہ ہے کہ ان کا نام اسکندر تھا، لیکن اس کے علاوہ عبداللہ، مرزبان، مرزبی اور ہرمس وغیرہ بھی مشہور ہیں اور یہ اسکندر، فیلقوس رومی کے بیٹے ہیں اور حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معاصر، انہیں نے خضر کی راہنمائی میں آب حیات کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی جستجو میں ناکام رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور اسکندر دنیا کی تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ دوسرا یونانی اسکندر، یونان میں یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہے اور ارسطو کے زمانہ کی مشہور شخصیت ہے۔ واللہ اعلم

ذوالقرنین کے متعلق بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے زمانہ میں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تھا اور ابن عبدالحق جو تفسیر اور حدیث کے مشہور امام ہیں ان کی تحقیق کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کے بعد میں تھا۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ دنیا میں چار اشخاص ہیں ان میں دو تو مسلمان تھے۔ ایک

حضرت سلیمان علیہ السلام، دوسرا ذوالقرنین، اور نمرود اور بخت نصر، یہ دونوں کافر تھے۔ پانچویں حضرت امام مہدی ہوں گے کہ وہ بھی اپنے وقت میں اقصائے مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک حاکم ہوں گی۔ یہ بحث بھی بڑی دلچسپ ہے کہ اسکندر کا نام ذوالقرنین کیوں ہوا؟ اس سلسلہ میں وہب بن منبہ کا قول یہ ہے کہ اسکندر دوقرن یعنی دو جانب زمین مشرق ومغرب یا روم وفارس یا پھر روم یا ترک کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے ذوالقرنین کے نام سے مشہور ہیں۔

حسن بصری کہتے ہیں کہ ذوالقرنین کے دوگیسو تھے، اسی وجہ سے ان کا یہ نام ہوا اور بعض کی رائے ہے کہ ان کے سر پر گائے بیل کی طرح دوسینگ تھے اور یہ بھی مشہور ہے کہ کیونکہ انہوں نے دوصدیاں مکمل بادشاہی کی اس لئے ان کو ذوالقرنین کہا گیا اور حضرت علی فرماتے تھے کہ جہاد میں ذوالقرنین کے سر کی دو جانبوں میں زخم آ گئے تھے اس لئے ان کا نام ذوالقرنین مشہور ہوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ایک مشہور تلمیذ ابن کواہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ذوالقرنین پیغمبر تھے؟ انہوں نے کہا نہیں پیغمبر تو نہ تھے البتہ بڑے پاک نفس لوگوں میں سے تھے اور جہاد کے موقع پر ان کے سر کی بائیں جانب میں ایک کاری زخم آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ پیدا کیا تو پھر ان کی داہنی جانب میں ایسا ہی گاؤ ہو گیا اب وہ مرے تو پھر زندہ نہ ہو سکے۔ اسی لئے ان کو ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں آفتاب تک پہنچا ہوں اور آفتاب کی دو جانبوں کو میں نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ اپنا یہ خواب قوم کے سامنے بیان کیا تو ان کی قوم ان کو ذوالقرنین کہنے لگی۔ بہر حال صحیح وجہ ان کو ذوالقرنین کہنے کی کوئی بھی متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔

لقمان اور ان کی نبوت: ذوالقرنین کی طرح لقمان کی نبوت میں بھی اختلاف ہے۔ لقمان کون تھے؟ اس سلسلہ میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے اور دوسری رائے کے مطابق ایوب علیہ السلام

کی خالہ کے لڑکے تھے۔ لقمان کے متعلق اکثر و بیشتر کا خیال یہی ہے کہ وہ ایک دانشمند اور حکیم آدمی تھے، پیغمبر نہ تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لقمان نے ایک ہزار پیغمبروں کو دیکھا تھا اور ان کے بلا واسطہ شاگرد تھے۔

ابن عباسؓ کی تحقیق ہے کہ لقمان نہ پیغمبر تھے اور نہ بادشاہ بلکہ وہ ایک حبشی غلام تھے اور بکریوں کو چرانے کا کام کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب فرما کر حکمت و دانائی، عقل و بزرگی، عطا فرمائی اور ان کی یہ پیروز بختی کیا کم ہے کہ قرآن مجید میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام: رہے خضر علیہ السلام تو اگرچہ ان کی نبوت میں بھی اختلاف ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ نبی ہیں، دراز عمر اور عام انسانوں کی نظر سے پوشیدہ قیامت تک زندہ رہیں گے، کیونکہ آبِ حیات انہوں نے پیا ہے اور جو آبِ حیات پی لے اس کو دوامی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ وہ ولی ہیں لیکن ان کے بادشاہ ہونے کا تخیل قطعاً غلط ہے۔ ہاں اہل علم و صلاح کا اس پر اتفاق ہے کہ خضر اس وقت زندہ ہیں اور جب تک دنیا سے قرآن نہ اٹھا لیا جائے گا وہ زندہ رہیں گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح بخاری میں لکھا ہے کہ خضر نبی ہیں اور ابن حجر کے مشہور شاگرد سخاویؒ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ قسطلانیؒ نے اپنی تالیف شرح بخاری میں خضر کا ضبط اعراب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خضر بفتح خاو کسر ضاد، یا بکر خاو سکون ضاد، ان کا نام بلیان ابن ملکان ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ خضر، فرعون کے لڑکے ہیں۔ اس تحقیق کی سخافت عیاں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خضر، ابن ملک ہیں اور الیاس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائی ہیں اور بعض نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صلبی بیٹا کہا ہے۔ واللہ اعلم

بہر حال یہ بحث تو یونہی ضمنی ہے۔ اصل بحث ان کی موت و حیات ہے جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں کہ مشائخ، جمہور علماء، خضر کی حیات ہی کے قائل ہیں لیکن امام بخاریؒ،

الحربیؒ، ابن المبارکؒ اور بن جوزیؒ نے ان کی حیات کا انکار کیا ہے، جو لوگ خضر کی حیات کا انکار کرتے ہیں یہ آنحضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی وفات سے قریب زمانہ میں فرمایا تھا کہ ہر وہ جاندار جو روئے زمین پر ہے سوسال کے بعد باقی نہ رہے گا۔ لیکن علماء نے اس ارشاد نبویؐ کی بہت سی توجیہات لکھی ہیں۔

اولیاء سے خضر کی ملاقات کے واقعات تواتر کی حد تک پہنچتے ہیں جس کے بعد خضر کی حیات کا انکار غیر مناسب ہے اور یہ بھی ہے کہ خضر کی آنحضور ﷺ سے بھی ملاقات ہوئی ہے اور آپ کی وفات کے بعد خضر، صحابہ کے پاس آنحضور ﷺ کی تعزیت کیلئے بھی آئے اور خضر کی حیات کا انکار کرنے والے جو آنحضور ﷺ کے اس ارشاد سے کہ ''اگر خضر زندہ ہوتے تو مجھ سے ضرور ملاقات کرتے'' اُن کی موت پر استدلال کرتے ہیں۔ تو یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ کا یہ ارشاد خضر سے ملاقات سے پہلے ہے۔ مشائخ نے بعض ان روایات کو خضر سے سنا ہے جن کو خضر آنحضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟: اسی طرح حضرت مریم، آسیہ، سارا، ہاجرہ، حوا اور ام موسیٰ جن کا نام یوکابد ہے ان کی نبوت میں بھی اختلاف ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ نبوت مردوں ہی کے ساتھ خاص ہے۔ قرآن مجید میں صاف طور پر موجود ہے کہ

وما ارسلنا من قبلک الا رجالاً نوحی الیھم۔

''ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا اور ان پر وحی بھی کی گئی''

اگرچہ قرآن حکیم میں ان عورتوں کا ذکر، انبیاء کے پہلو بہ پہلو کیا گیا ہے اور وحی کی بھی ان کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ تاہم ان کی نبوت کا یقین تو پھر بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآنِ کریم وحی کو کبھی کبھی الہام اور اعلام کے معنے میں بھی لیتا ہے جیسا کہ خود قرآن کریم میں ہے کہ: **''واوحی ربک الی النحل''**

''یعنی تیرے خدا نے شہد کی مکھی کو بتایا''

ظاہر ہے کہ اس آیت میں وحی کے معنی سوائے الہام اور اعلام کے اور کچھ نہیں کئے جا سکتے۔ جب اس سے معلوم ہوا کہ وحی قرآن میں دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ جن عورتوں کے ساتھ وحی کی نسبت کی گئی ہے وہاں بھی وحی سے الہام اور اعلام ہی مراد ہو اور انبیاء کے ساتھ ان عورتوں کا ذکر تو وہ بھی ان کی نبوت کو ثابت کرنے کیلئے کوئی قوی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ انبیاء کے دوش بدوش ان کا تذکرہ محض ان کے اکرام واحترام کی وجہ سے ہے نبوت ورسالت کی وجہ سے نہیں ہے۔

نبی سچا ہوتا ہے: تمام انبیاء صلوٰۃ واللہ علیہم صادق ومصدوق ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بالکل سچ ہوتا ہے اور جو خبر بھی دیتے ہیں وہ خدا ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ ان کے تمام احکام اور ہر نہی خدا ہی کے حکم پر ہوتی ہے اور انبیاء کا مقدس طائفہ ہر قسم کے گناہ سے پاک بھی ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب رسالت کے دُعاوی معجزہ کی وجہ سے ثابت ہو گئے، تو پھر نبی جو کچھ کہے گا وہ یقیناً خدا ہی کی طرف سے ہوگا۔

"ما علی الرسول الا البلاغ"

نبی اگر جھوٹ بولنا شروع کر دے تو رسالت کے مقاصد کو شدید نقصان پہنچے گا اور اگر وہ خود نافرمانی کو اپنا طریقہ بنالیں اور معصیت سے لبریز زندگی گزاریں تو عام انسان بھی ان سے نفرت کرنے لگیں گے اور ان کے کہنے سننے پر عمل کرنے کیلئے کوئی بھی تیار نہ ہوگا۔ ان گوناگوں اسباب کی بنا پر عقل نبی کے سچے اور صادق ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔

نبی سے گناہ نہیں ہو سکتا: علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ وہ کذب بیانی اور کبائر سے قطعاً محفوظ ہوتے ہیں۔ یعنی کبائر ان سے نہ ارادتاً صادر ہو سکتے ہیں اور نہ سہواً اور چھوٹے چھوٹے گناہوں سے وہ اس معنی کر کے محفوظ ہوتے ہیں کہ اپنے ارادہ اور قصد سے ارتکاب نہ کریں گے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ انبیاء سے بڑے بڑے گناہ سہواً اور چھوٹے گناہ قصداً ہو سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی ایسی لغزش ہے جس سے عوام نفرت کرتے ہوں اور اس سے عام نظروں میں نبی کے حقیر ہو

جانے کا خطرہ ہو مثلاً کہیں سے ایک آدھا لقمہ چرالینا یا ایک دانہ کی خیانت کرنا وغیرہ تو ایسی لغزشوں سے بھی انبیاء کا محفوظ ہونا ضروری ہے۔

ان مذاہب کے مقابلہ میں اہل سنت والجماعت کا مذہب مختار یہی ہے کہ نبی گناہ کبیرہ کا نہ قصداً ارتکاب کرسکتا ہے اور نہ بھول کر۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک انبیاء کی عظمت اور جلالت قدر کے مناسب ہے اور سہو ونسیان کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ رسالت اور احکام کی تبلیغ کی حدود میں نبی سے بھول چوک نہیں ہو سکتی لیکن اس کے علاوہ دوسری چیزوں اور کاموں میں بتقاضائے بشریت ان سے نسیان ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سجدہ سہو ہی کو لے لیجئے۔ دیکھئے نماز میں کچھ بھولنے پر سجدہ سہو انبیاء نے کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ رسالت اور احکام کے علاوہ دوسرے شعبوں میں ان سے نسیان وسہو کا واقع ہونا بعید نہیں ہے۔

ایک اور بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انبیاء کی لغزشوں کی داستان جو عام طور پر مشہور ہے ان میں اکثر وبیشتر حصہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے اور جو زلات ان سے ہوئیں علماء نے ان کی تاویلات اور توجیہ کی ہے۔ وہ دوسری بڑی کتب میں موجود ہیں۔ وہاں دیکھ لیا جائے لیکن پھر بھی ان لغزشوں کا اعتقاد نہیں رکھنا چاہئے۔

ہاں اہل سنت والجماعت کا انبیاء کے بارے میں یہ بھی عقیدہ ہے کہ نبی کو نبوت و رسالت محض خدا کے فضل وکرم پر ملتی ہے۔ اس میں نبی کی جدوجہد اور کسب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جب یہ بات ہے تو نبوت نبی سے کبھی سلب بھی نہیں ہو سکتی اور نہ اس عہدے سے اس کو معزول کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہئے کہ رسالت نبی کی موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ وہ یقیناً زندہ رہتے ہیں۔ بس ان کی موت ایک بار ان پر طاری ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان کی روح ان کے اجسام میں لوٹا دی جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی کی طرح ان کو زندگی فوراً بخش دی جاتی ہے، انبیاء کی یہ حیات شہداء کی زندگانی سے بڑی طاقت ور ہوتی ہے کیونکہ شہداء کی حیات اخروی صرف معنوی ہے۔ انبیاء کی حیات معنوی نہیں ہوتی اور اس شبہ میں ہرگز نہ پڑنا چاہئے کہ شریعت جب ایک نبی کی منسوخ ہوگئی تو

گویا اس کی نبوت بھی جاتی رہی۔ ہرگز نہیں شریعت کے منسوخ ہونے سے نبوت کا اختتام لازم نہیں آتا اور رہے اولیاء تو وہ دنیوی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی ولایت کے سلب ہونے کے اندیشہ سے مامون نہیں، ہر وقت یہ خطرہ ان کو درپیش ہے۔ ہاں اگر ایمان پر خاتمہ ہو گیا تو پھر مرنے کے بعد بھی وہ مومن اور ولی ہوں گے۔ جیسا کہ سونے کی حالت میں ان کی ولایت اور ایمان باقی تھا۔ اس طرح مرنے پر بھی یہ دونوں صفات قائم رہیں گی۔ واللہ اعلم

لیکن قبروں سے استمداد اور استعانت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ فقہاء کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے لوگوں کی قبروں کی زیارت کی جو اجازت شریعت نے دی ہے یا تو وہ عبرت حاصل کرنے اور موت کو یاد کرنے کیلئے ہے یا پھر نفع پہنچانے اور مردوں کیلئے طلب مغفرت کے پیش نظر اجازت دی گئی ہے۔ جیسا کہ جنت البقیع کے مردوں کیلئے آنحضور ﷺ کا عمل اسی حد تک تھا۔ ان اسباب کی بناء پر فقہاء قبروں سے استمداد کو ناجائز شمار کرتے ہیں۔ فقہاء کے خلاف، حضرات صوفیاء قدس اللہ اسرارہم کا مسلک یہ ہے کہ بعض اولیاء کا تصرف عالم برزخ میں دائمی ہے اور ان کی مقدس ارواح سے توسل و استمداد ثابت و موثر ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جن لوگوں سے ان کی زندگی میں توسل و تبرک حاصل کیا جاتا تھا موت کے بعد بھی ان سے برکت حاصل کی جا سکتی ہے۔ غزالی کی یہ تحقیق معقول ہے کیونکہ احادیث اور علماء کے اتفاقی قول سے یہ ثابت ہے کہ مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہے اور یہ بھی ہے کہ موت و حیات دونوں حالتوں میں روح ہی متصرف ہے بدن سے تصرف کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا یقین رکھنا چاہئے کہ حقیقی تصرف تو اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں تاہم روح کا بھی تصرف کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔

نیز ولایت کا مطلب یہ ہے کہ انسان فنا فی اللہ ہو جائے اور یہی مقصد زندگی ہے فنائیت کی یہ نسبت موت کے بعد اور بھی طاقتور انداز میں آشکارا ہوتی ہے۔ ارباب کشف و تحقیق یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح ایک آئینہ دوسرے آئینہ کے مقابل میں آ کر

ایک دوسرے کے عکس کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اسی طرح جب زیارت کرنے والا کسی کی قبر پر پہنچتا ہے تو صاحب قبر کی روح، زائر کی روح پر اپنے فیضان کی شعاعیں ڈالتی ہے اور انوار و تجلیات کا عکس زائر کی روح پر پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اولیاء اللہ کے مثالی بدن بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ان مثالی ابدان کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور طالبین کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا جو انکار کرتے ہیں ان کے پاس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک بڑے امام تصوف کا ارشاد ہے کہ میں نے چار لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنی قبروں میں برابر تصرف کر رہے ہیں اور عالم برزخ میں ان کا یہ تصرف دنیوی حیات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، ان چار لوگوں میں سے ایک تو شیخ معروف کرخیؒ ہیں اور دوسرے شیخ عبدالقادرؒ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جس کیلئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ باتیں ہم نے ''جذب القلوب الی دیار المحبوب'' میں بھی لکھی ہیں۔

افضل الانبیاء: آنحضور ﷺ کی نبوت کا ثبوت ان معجزات سے ہوتا ہے جو تواتر کی حد تک مشہور ہیں اور جن کو باور کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ آپؐ کے معجزات کثیر ہیں اور ہر جنس کے ہیں۔ بخلاف دوسرے انبیاء کے ان کے معجزات اکثر ایک ہی جنس کے ہوتے، کسی نبی کو زیادہ سے زیادہ دو جنس کے معجزے دئے گئے ہیں اور بس آپ کے معجزات کی کثرت اور عموم کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ تمام اجزائے عالم، ارض وسما اور ملک وملکوت میں آپ کا تصرف جاری تھا اور جتنے بھی کمالات تمام انبیاء کی ذات میں موجود تھے۔ آپ کی ذات شریف ان مجموعہ کمالات کا حسین پیکر تھی۔

''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری''

آپؐ خود فرماتے ہیں کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں لیکن اس کے باوجود اس پر مجھے کوئی فخر بھی نہیں ہے۔ اولاد آدم اور بنی آدم کے معنی نوع انسان کے آتے ہیں۔ اس

لئے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اس میں داخل ہیں اور بلاشبہ ان کے بھی سردار ہیں۔ اس سے زیادہ صاف آپ کا یہ ارشاد ہے کہ آدم اور دوسرے سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ہی افضل اور اشرف ہیں۔ آپ کے بعد علماء کی تحقیق کے مطابق حضرت ابراہیم خلیل اللہ افضل ہیں اور پھر موسیٰ عیسیٰ اور نوح علیہم السلام کو شرف و فضل حاصل ہے۔ انبیاء کی طویل فہرست میں یہ پانچ نبی اولو العزم سمجھے جاتے ہیں۔ راہِ حق میں ان کا صبر اور عزیمت قابل داد ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

آپ کا سب سے بڑا معجزہ: آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے جو کہ خدائے بزرگ و برتر کی صفات کا مظہر اور اس کا کلام قدیم ہے یہ معجزہ گردشِ لیل ونہار اور انقلابِ صبح و شام کے باوجود موجود ہے جبکہ دوسرے معجزات ہوتے رہے اور ساتھ ہی ختم ہوتے رہے۔ بس ان ختم ہونے والے معجزات کے سلسلہ میں ان کے متعلق شہرت جو تواتر تک پہنچی ہوئی ہے باقی ہے، ورنہ وہ خود ختم ہو چکے لیکن قرآن کریم سراپا اعجاز آج بھی موجود ہے اور موجود رہے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) آپ کی سچائی اور قرآن کی قرآنیت پر سب سے بڑھ کر دلیل وہ آیت ہے جو آپؐ نے عرب کے فصحاء کے درمیان میں کھڑے ہو کر واشگاف سنائی، لیکن اس کا جواب دینے اور اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت کسی کو بھی نہ ہو سکی حالانکہ وہ عرب کے فصیح و بلیغ تھے اور آپ کی ذاتِ اطہر و دین کے شدید دشمن اور معاند تھے۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ:

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسورۃٍ من مثلہ.

''اور اگر تم کو شک ہے اس کلام میں جو اتارا ہم نے اپنے بندہ پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی''۔

یہ مسلم ہے کہ نبی کو معجزہ اسی جنس سے دیا جاتا ہے جو نبی کے دور میں فضیلت وامتیاز کا باعث سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ موسیٰ کے دور میں سحر و جادو خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا تو

آپ کو معجزہ بھی اسی طرح کا دیا گیا۔ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ آیا تو طبابت ایک ایسا امتیاز تھا جس پر شرف وفضل کے فیصلے ہوتے۔ عیسیٰ کو اسی جاوید فن کے معجزے دیئے گئے۔ آپ ﷺ کے وقت میں عرب کی زمین فصاحت و بلاغت کے بلند بانگ دعوؤں سے گونج رہی تھی اور ہر مجلس ومحفل، زبان دانی کا مظاہرہ کرنے کیلئے بہترین میدان بنی ہوئی تھی۔ پھر ہر ایک کو آپ ﷺ کے مشن سے اختلاف اور بڑھ کر آپ ﷺ کا مقابلہ کرنے کا جنون سوار تھا، ان تمام حالات میں غور کیجئے کہ آپ ﷺ واشگاف اعلان کرتے ہیں۔ مگر اپنے خاص فن اور میدان میں اس تعدی کو قبول کرنے کی کوئی جرأت کیوں نہیں کرتا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تیر و تفنگ کی لڑائی کی دعوت تھی نہ شمشیر و سنان کے دست بدست آزمانے کا اعلان تھا۔ بلکہ حروف الفاظ اور کلمات جو ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رہتے ہیں انہیں میں مقابلہ کرنے کا عام اعلان کیا گیا تھا مگر عرب کے فصحاء کو اس چیلنج کو قبول کرنے کی تاب و طاقت اپنے اندر نظر نہ آئی اور کوئی بھی قرآن ایسے دو لفظ بھی مرتب نہ کر سکا کیا یہ قرآن کا کھلا اعجاز نہیں ہے؟ بلاشبہ اعجاز ہے، معجزہ ہے اور اس کی حیرت انگیز کامیابی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب سورہ اقرأ نازل ہوئی تو عرب کے عام دستور کے مطابق آپ ﷺ نے کعبہ کے دروازہ پر اس کو آویزاں کرنے کا اہتمام کیا۔ عرب کے فصیح و بلیغ آتے تو کوئی اس کی شوکت بیان دیکھ کر حیران ہوتا تو کوئی کلمات کی بندش پر وارفتہ ہوتا۔ الفاظ کی نشست قابل داد سمجھتے تو معجزانہ بلاغت پر سر دھنتے اور ہر ایک یہی کہتا جاتا کہ خدا کی قسم یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔ انسانوں کی قدرت میں نہیں کہ اس کے مقابلہ میں کچھ کہہ سکیں۔ مگر اس کے باوجود معتزلہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قرآن کریم کی طرح کلام کو مرتب کرنا انسان کی قدرت میں ہے اور خود عرب والوں کی بھی قدرت میں تھا، لیکن خدا کی غیر محدود طاقت نے ان کی تاب و ہمت کو قرآن کا مقابلہ کرنے سے روکے رکھا اور ان کے منہ پر ایک مہر لگا دی جس کی وجہ سے وہ قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے۔ معتزلہ کی اس حماقت کے باوجود قرآن کے اعجاز کا مسئلہ اب بھی جوں کا توں

ہے۔ کیونکہ تعدی کو قبول کرنے کی جرأت کو سلب کر لینا باوجود یہ کہ قدرت بھی تھی اور مقابلہ کرنے کا جنون بھی سوار تھا۔ بجائے خود ایک معجزہ ہے، لیکن پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ معتزلہ کی یہ سفاہت وحماقت ہے۔ وہ بتائیں تو سہی کہ آخر انہوں نے یہ کہاں سے جانا کہ کفار میں اس مقابلہ کی طاقت تھی۔ اپنے اس دعوے پر ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اپنے اس مدعا کو ثابت کرنے کیلئے ان کے پاس کون سے شواہد ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی شخص کو خدا کے علاوہ یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ قرآن کا مثل پیش کر سکے۔ اب تو کیا ہوتی اس دور میں بھی نہیں تھی جبکہ عرب کی زمین فصاحت و بلاغت کے یکہ تازوں کیلئے میدان بنی ہوئی تھی۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القران لایأتون بمثله ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً.

''تو کہہ کہ اگر جن وانس اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ قرآن جیسا کلام لے آئیں تو نہیں لا سکتے اگر چہ ان میں بعض بعض کے مددگار بھی ہوں۔''

اب اس صاف اعلان کے بعد کیا کہنے سننے کا موقع رہا ہے اور بات تو یہ ہے کہ اگر آپ آنحضورﷺ کی حیات پاک کا جائزہ لیں گے تو آپ کی زندگی کا ہر شعبہ ایک اعجاز اور اعجاز گر معجزہ نظر آئے گا۔ آپ کی ذات حسن وناز کا پیکر ہے۔ جمال وکمال کا مظہر ہے۔

ہر جلوہ جمال ترا ناز دیگر است	ہر نغمہ کمال ترا ساز دیگر است
اعجاز حسن را سخن نیست احتیاج	ہر غمزہ ز چشم تو اعجاز دیگر است

رسول الثقلینؐ: آنحضورﷺ جن وانس کی جانب مبعوث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو رسول الثقلین کہا جاتا ہے۔ جنات کا آپﷺ کے یہاں آنا، آپ کی دعوت پر ایمان لانا، اپنی قوم میں واپس جا کر آپؐ کے مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا یہ سب

باتیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اکثر علماء کی رائے ہے کہ جن وانس کی جانب نبی و رسول کی حیثیت سے صرف آپ ﷺ ہی مبعوث ہوئے ہیں۔ کسی اور نبی کی دعوت اس درجہ عام نہیں ہوئی ہے لیکن شیخ سیوطیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ جن پہلی امتوں میں بھی مکلّف تھے اور نبی یا کسی سچے شخص سے جو کہ نبی سے براہِ راست سننے والا ہو سنے بغیر تکلیف اور احکام کا مکلّف بنانا سمجھ میں نہیں آتا اور اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جنات میں کوئی نبی نہیں ہوا۔ اسی طرح قرآن مجید میں جنوں کا یہ قول بھی موجود ہے کہ:

انا سمعنا کتاباً انزل من بعد موسیٰ مصداقاً لما بین یدیہ الی الحق والی طریق مستقیم۔

”ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنی سی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے“۔

اس سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے اور ان کی ہدایت کی روشنی میں حق کی راہیں ان پر کھل گئی تھیں۔ اس لئے ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی امتوں میں جنات انبیاء کے مخاطب سے ہی ہیں اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جنوں کی جانب آنحضور ﷺ سے پہلے کوئی نبی مرسل نہیں آیا، زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء سابقین سے، جنات کی بالمشافہ گفتگو نہ ہوتی تھی بس وہ کلام اللہ کو سن کر ان کی دعوت پر عمل پیرا ہوتے۔ بخلاف آنحضور ﷺ کے کہ آپ کی جنات سے بالمشافہ گفتگو ہوئی اور آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ سیوطیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ضحاک کی بھی یہی رائے ہے کہ اور یہی تحقیق قرین صواب بھی ہے۔

ایک کمزور روایت یہ بھی مشہور ہے کہ آپ ملائکہ کی جانب بھی نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ محققین کی رائے یہ ہے کہ آپ تمام دنیا اور ہر قسم کی موجودات نباتات وحیوانات کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ موجودات کے تمام انواع وافراد کے مربی ہیں اور ہر شے کی تکمیل کے آپ باعث ہیں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتایئے کہ شجر وحجر آپ

کو سلام و سجدہ کیوں کرتے تھے اور حیوانات تک نے آپ کی رسالت کی شہادت کیوں دی ہے؟ یہ فرق آپ ضرور کر سکتے ہیں کہ جن وانس کیونکہ مختار اور باارادہ مخلوق ہے۔ ان سے کفر و معصیت ہو سکتی ہے اور باقی موجودات سوان سے سوائے اطاعت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جیسا کہ ملائکہ کے صرف اطاعت کے پیکر ہیں اور معصیت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ ''وما ارسلنک الا رحمة للعالمین'' سے بھی اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

معراج: یاد رکھنا چاہئے کہ آپ کے ایمان کی آزمائش گاہ معراج کے واقعہ کی تصدیق ہے۔ آپ کو اس کی تصدیق کرنی چاہئے کہ ایک مختصر وقت میں، اپنے جسم اطہر کے ساتھ آسمان، عرشِ عظیم بلکہ عرش سے بھی ماوراء لامکاں تک ان تمام تفصیلات کے ساتھ جو صحیح احادیث ہیں معراج سے متعلق ملتی ہیں۔ آنحضور ﷺ نے آسمانی سفر فرمایا ہے۔ آپ کا یہ روحانیات کی جانب سفر تھا تو جہت و زمانہ کی قیود سے بے نیاز ہے اور جس کو مسافتوں کی حدبندیوں میں بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ارباب کشف و شہود نے کچھ وہاں کے حالات بیان کئے ہیں اور بس، اور اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ سننے کے ساتھ ہی بغیر کسی تردد اور خلجان کے آپ ایمان لائیں۔ اگرچہ آپ کو نہ اس کی کیفیت معلوم ہے اور نہ حقیقت سے واقفیت ہو۔ اگر خدا کے فضل سے آپ کو کبھی اس کی حقیقت پر بھی اطلاع بخشی جائے تو پھر یہ محض انعام و کرم ہے۔ تاہم اس کی فکر میں نہیں رہنا چاہئے اور بلا تامل ایمان لانا چاہئے۔ حقائق پر اطلاع یہ تو ایک ایسا مقام ہے جس پر اہلِ معرفت کی نگاہ پہنچ سکتی ہے اور یہ وہ مقام اعلیٰ ہے جو انہیں کی زد میں آ سکتا ہے جو بشریت کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو پاک کر چکے ہوں۔

لیکن محبت کی سدا بہار دنیا میں اور تسلیم و ایمان کی حسین فضاؤں میں تصور اور تکلف واصل کے کسے فرصت اور کسے اتنا موقع کہ ان عنوانات پر دماغ سوزی کرے، یہاں تو سنا اور سن کر ایمان لانا دو ساتھ ساتھ چلنے والے معاملہ ہیں۔ حضرت ابوبکر کو صدیق کا خطاب اس پر ہی ملا کہ معراج کے قصہ کو سنا اور بے تامل ایمان لے آئے اور بعض بدنصیب اسی واقعہ پر لڑکھڑائے گئے اور ایمان کی راہ کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ پر چل نکلے۔

نعوذ باللہ اور جناب ابو بکر صدیقؓ کے کمال ایمان کو کیا کہنا ایک واقعہ معراج ہی کیا آپ نے تو ایمان لانے کے وقت میں بھی کسی معجزے کا مطالبہ نہ کیا۔ بس آنحضور ﷺ سے ایمان کی دعوت سنی اور بلا تامل اس کو قبول کیا۔

بہر حال جب آپ ﷺ معراج سے تشریف لائے اور آپ سے اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کے سلسلہ میں سوالات کئے گئے تو آپ ﷺ نے جواب کے مختلف پیرائے اختیار کئے۔ کسی کے سامنے حقیقت کو کھول کر رکھ دیا، کسی کے جواب میں استعارہ اور کنایہ کی آڑ پکڑی، مجاز سے باہر قدم نہ نکالا، آپ کے اس طرز سے بجا طور پر ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہر شخص میں یہ استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ بعض خاص معاملات سے اس کے سامنے پردے اٹھا دئے جائیں اور سب کچھ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے بس الفاظ اور عبارت کے لباس بدل دئے جاتے ہیں۔ ٹھیک یہی ہے کہ معراج میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جہاں تک دل کی آنکھوں سے دیکھنے کا تعلق ہے تو ان سے تو آپ دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ معراج کی رات ہی کی اس میں کیا تخصیص ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ ایک ہی دل سے دیکھنا اور ایک دل سے جاننا آنحضور ﷺ معراج سے قبل دل سے خدا کو جانتے تھے اور معراج کی رات آپؐ نے خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ (لیکن یہ باتیں اور یہ فرق ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مختار قول وہی ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے)۔

☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

۱ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن محمد، بن علی بن محمود بن احجر الکنانی عسقلانی المصری قاضی القضاۃ اور فقہ شافعی کے زبردست وکیل اور ترجمان ہیں۔ ۲۳ شعبان ۷۷۳ھ کو ولادت ہوئی۔ لکھا ہے کہ ان کے والد کے یہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ ایک روز ان کے والد بڑے کبیدہ خاطر شیخ صنا تیری کے یہاں جو کہ اولیاء کبار میں سے تھے۔ حاضر ہوئے شیخ نے دیکھ کر فرمایا کہ تمہاری پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو دنیا کو علم سے بھر دے گا۔ شیخ کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور حافظ ابن حجر نے اپنی عزرات علمیہ کا دنیا سے لوہا منوا لیا۔

۲ شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبدالرحمن السخاوی حافظ ابن حجر عسقلانی کے مشہور تلمیذ اور علم و تجربہ میں ان کے صحیح وارث تھے۔ مقاصد الحسنہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ۹۰۲ھ میں وفات ہوئی۔

۳ شہاب الدین احمد بن محمد القسطلانی المصری ۱۲ ذیقعدہ ۸۵۱ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ جامع عمری میں درس و تدریس کے ساتھ وعظ و نصیحت کا بھی مشغلہ رکھتے تھے۔ وعظ ایسا اثر انگیز اور پاتاثیر ہوتا کہ ہزاروں آدمی صرف وعظ سننے کیلئے جامع عمری میں پہنچتے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ کے معاصر ہیں اور شیخ کی تصانیف سے کافی استفادہ کیا ہے لیکن اپنی تصانیف میں سیوطیؒ کے حوالہ سے گریز کرتے تھے۔ اس پر سیوطیؒ کو خاص شکایت تھی اور ایک مجلس میں انہوں نے قسطلانیؒ کو خاموش بھی کر دیا تھا۔ بہت سی تصانیف ہیں لیکن سب سے زیادہ قسطلانی شرح بخاری مشہور ہے۔ جمعہ کی شب محرم کی ساتویں تاریخ ۹۲۳ھ میں قاہرہ میں وفات ہوئی۔

۴ شیخ الاسلام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری آپ کی ولادت نماز جمعہ کے بعد ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو نواحی بخارا میں ہوئی۔ آپ کی مشہور تالیف بخاری شریف، قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ قوت حافظہ بے نظیر اور ذکاوت و ذہانت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ تفقہ تو مسلم ہی ہے لیکن امت کے اہل فضل و کمال نے مجتہد بھی آپ کو تسلیم کیا ہے۔ آپ کی تالیف کو امت میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی نظیر امت کی تصنیف و تالیف کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عید الفطر ۲۵۶ھ سنیچر کی شب میں سمرقند کے قریب قریہ خرتنگ میں علم و کمال کا یہ آفتاب روپوش ہو گیا۔

۵ ابو اسحاق الحربی بڑے زبردست عالم ہیں ۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے اور امام احمد بن حنبل سے فقہ حاصل کیا۔ ۲۸۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۶ ابو عبدالرحمن عبداللہ بن مبارک ان کے والد غلام تھے۔ زہد و تورع میں نہایت مشہور، ۹۰ھ یا ۱۰۰ھ عبداللہ کی ولادت ہوئی۔

شباب کا دور منکرات میں گزرا لیکن ایک خاص واقعہ کے بعد تنبیہ ہوئی اور دنیا سے دامن کو جھاڑ کر اٹھ

گئے۔ ابو حنیفہ امام کے مکتب فکر کے رکن ہیں اور تفقہ میں امام اعظم سے بے حد مشابہ تھے۔ ۱۸۱ھ میں موصل کے قریب جبکہ وہ جہاد سے لوٹ رہے تھے مسافرت ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

ے ابو الفرج عبدالرحمٰن بن ابی الحسن الجوزی، جوزی بفتح جیم وسکون داؤد، جوز کی جانب نسبت ہے جو ایک مشہور جگہ کا نام ہے۔ ۵۰۸ھ یا ۵۱۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ کثیر تعداد میں تصانیف و تالیفات ان کے قلم سے نکلی ہیں تا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ان تصانیف کو اگر روزانہ تصنیف کی مقدار پر تقسیم کیا جائے تو ہر روز ۹ نو جز کا حساب بیٹھتا ہے۔ ابن خلکان نے اس کو مبالغہ سمجھا ہے تاہم کثیر التصانیف ہونے کا ابن خلکان کو بھی اقرار ہے۔ جمعہ کی شب ۱۲ رمضان ۵۹۷ھ میں وفات ہوئی اور باب حرب میں سپرد خاک کئے گئے۔

۸ ابو حامد محمد بن محمد بن احمد الغزالی حجۃ الاسلام لقب ہے، فقہ شافعی کے زبردست موید ہیں۔ طوس میں احمد رازکانی سے پڑھا اور پھر نیشا پور میں پہنچ کر امام الحرمین ابو المعالی جوینی کے درس میں شریک ہوئے۔ تھوڑی ہی مدت میں علامۃ العصر بن گئے اور مدرسہ نظامیہ کی صدارت ان کے سپرد ہوئی۔ مدت تک اس عظیم الشان یونیورسٹی میں ان کے فیضان علم وکمال کا دریا موجیں لیتا رہا آخر میں دنیا سے دامن جھٹک کر اٹھ گئے۔ ۴۵۰ھ میں ولادت ہوئی اور طوس کے قصبہ طابران میں ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ میں وفات ہوئی۔

۹ ان کے والد کا نام بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق فیروز یا فیروزان ہے۔ ابتدائی زندگی میں ان کا مذہب آتش پرستی تھا لیکن پھر حضرت علی بن موسیٰ رضا کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے۔ بڑے صوفی اور پاک باز انسانوں میں سے ہیں۔ ۲ محرم یا ۸ محرم ۲۰۰ھ کو وفات ہوئے۔

۱۰ امام ائمہ محی الدین شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ، معروف شخصیت، سلسلہ تصوف کے منتہی اور اس مکتبہ فکر کے مسلم امام، طبرستان کے علاقہ میں جس کو جیلانی یا گیلانی کہا جاتا ہے آپ کی پیدائی ہوئی۔ غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، جلاء الخواطر آپ کی تالیفات ہیں، شنبہ کی رات ۸ یا ۹ ربیع الثانی ۵۶۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

خیر الامم ﷺ

جس طرح آپ کی ذات گرامی سب سے اشرف، سب سے افضل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی بھی تمام اُمتوں میں سب سے اشرف اور افضل ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (القرآن)

''تم بہترین امت ہو جن کو انسانوں کی طرف بھیجا گیا''۔

ایک حدیث میں ہے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں تمہاری (امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی عمر اتنی ہے جتنا کہ عصر اور مغرب کے درمیان مختصر وقت ہوتا ہے (یعنی تم کو دوسری امتوں کے مقابلہ میں وقت نہایت کم ملا ہے) لیکن اس کے باوجود ان امتوں کے مقابلہ میں ثواب تم کو ہی زیادہ ملے گا اور نصاریٰ و یہود کے مقابلہ میں تمہاری بات کچھ ایسی ہے کہ کسی شخص نے تین مزدور کام پر لگائے۔ ایک کو جس نے صبح سے دوپہر تک کام کیا ایک قیراط (معمولی وزن) دیا اور دوسرے کو جس نے دوپہر سے عصر تک محنت کی اس کو بھی ایک قیراط دیا اور تیسرے کو جس نے عصر سے مغرب تک کام کیا دو قیراط دینے کی بات ٹھیرائی۔ جب شام ہونے لگی اور مزدوروں کو ان کی اجرت دینے کا وقت آیا تو پہلے دو مزدوروں کو ایک ایک قیراط دیا اور تیسرے کو دو قیراط دیئے اس پر وہ مزدور غضب ناک ہو گئے اور بولے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ ہمارا کام زیادہ اور مزدوری کم اور اس کا کام کم لیکن اجرت زیادہ؟ اس پر اُس شخص نے جواب دیا کہ تم سے جو کچھ اجرت میں نے ٹھیرائی تھی وہی دی نہ کم نہ زیادہ۔ اس کے بعد میرا فضل ہے جس کو چاہے دوں نہ دوں۔ پہلا مزدور یہودی ہے اور دوسرا نصرانی اور تیسرا امت مرحومہ کا شخص ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ایسی ہیں جن میں اس امت کے ثواب کی

کثرت اور فضائل آپ ﷺ نے ذکر کیے ہیں اور بات بھی یہی ہے کہ علوم و معارف، حقائق و دقائق اور عجائب غرائب جو اس امت کے افراد کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ اس کی مثال بھی دوسری امتوں میں نہیں ملتی (اس لئے یہ امت ان فضائل کی بجا طور پر مستحق ہے جو احادیث و قرآن میں اس امت کیلئے ذکر ہوئے ہیں)

آپ ﷺ کا دین: آپ ﷺ کی شریعت پہلی تمام شریعتوں کے مقابلہ میں کامل اور آپ کا دین تمام ادیان کیلئے ناسخ ہے۔ جب آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں تو آپؐ کے بعد تکمیل کیلئے کسی اور شریعت و دین کے انتظار کا تخیل بھی غلط ہے۔

بعثت لا تمم مکارم الاخلاق.

"میں مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے مبعوث ہوا ہوں"۔

آپ ﷺ کے اس ارشاد میں اسی حقیقت کی نقاب کشائی ہے کہ اب کوئی شریعت و دین آنے والا نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام کی شریعت قہر و جلال کا مظہر تھی۔ گناہوں کی پاداش میں قتل، پاکیزہ غذاؤں کی حرمت، مال غنیمت کا ناجائز ہونا اور لغزشوں پر فوراً ہی سزا و عقوبت شریعت موسوی کی شدت کا اظہار کرتی ہے۔ خود موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام عظمت و ہیبت کا پیکر تھے اور دشمنان دین پر مواخذہ میں ایسے مشہور واقع ہوئے تھے کہ آپ کے پر جلال چہرہ کی طرف کسی کو نظر اٹھانے کی بھی جرات نہ تھی۔

اور عیسیٰ علیہ السلام لطف و کرم کے مظہر اور سہل پسندی و نرم خوئی کے منارہ تھے۔ آپ ﷺ کی شریعت فضل و احسان نرمی و رفق کی مجموعہ تھی۔ نہ قتل تھا نہ قتال نہ اعدائے دین سے جہاد تھا نہ جھڑپ بلکہ قتال آپ کی شریعت میں حرام تھا۔ انجیل میں تو یہاں تک ہے کہ جو تمہارے ایک رخسار پر طمانچہ مارنے کا ارادہ کرے تو تم اپنا دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو اور جس نے تمہارا کپڑا لینے کا خیال کیا تم اپنی چادر بھی اس کے سامنے ڈال دو۔ جو شخص ایک میل تک تم کو بیگار میں لے جانا چاہتا ہے تو تم دو میل تک اس کے ساتھ چلے جاؤ، یہ تھے عیسوی شریعت کے احکام۔ مگر شریعت محمدی علیٰ صاحبہا صلوٰۃ

والسلام لطف وکرم کا مجموعہ قہر وجلال کا مظہر ہے اس میں موسوی دین کی قوت وبطش بھی ہے اور عیسوی طریقہ کی نرمی ولطافت بھی (ریشم کی طرح نرم بھی اور فولاد کی طرح سخت بھی) ''انا الضحوک القتول'' میں یہی بتایا گیا ہے کہ قہقہے بھی ہیں لیکن ان قہقہوں میں دارو گیر کے ہنگامے بھی ہیں۔

بخندہ نمکین دل بری وجاں بخشی　　　تبارک اللہ آہ ایں چہ خندہ وچہ لب است

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث۔

''پاکیزہ چیزیں ان کیلئے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے''۔

اس سے بھی شریعت مصطفویؐ کی جامعیت کا اظہار ہوتا ہے اور اگر آپ آنحضورﷺ کی سیرت اور آپؐ کے احکام اور شریعت کا مفصل جائزہ لیں گے تو آپ بھی آپ کی شریعت کی جامعیت اور معتدل مزاج ہونے سے واقف وآگاہ ہو جائیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین: آنحضورﷺ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام امت میں سب سے زیادہ افضل اور اشرف ہیں (یہ شرف ان کیلئے کیا کم ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت، اعانت اور نصرت کیلئے منتخب کیا اور اس دین کی تقویت اور اس ملت عظمیٰ کے استحکام کا باعث وہ بنے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

وکانوا احق بها واهلها وکان اللہ بکل شیء علیماً (القرآن)

''اور یہ تھے اس کے لائق اور اس کام کے اہل اور ہے اللہ ہر چیز سے خبردار''۔

کثرت سے ایسی احادیث اصحاب النبی کی مدح وستائش، مناقب وفضائل میں ملتی ہیں جن کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ امت کے اخیار یہی ہیں اور اپنے اجر وثواب کے اعتبار سے پوری امت پر فائق ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے ہر ایک شخص احد پہاڑ کی برابر سونا خدا کی راہ میں تقسیم کرے تو اس آدھے پیمانہ جو کی برابر

نہیں ہوسکتا جو میرے صحابہؓ نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے۔

(یہ اس لئے کہ صحابہؓ نے اس وقت خرچ کیا جبکہ اسلام کو اس طرح کی امداد سب سے زیادہ مطلوب تھی یا پھر اس وجہ سے کہ اخلاص کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

"خیر القرون قرنی"

"یعنی میرا زمانہ سب سے اچھا ہے۔"

اس سے بھی صحابہ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا اور صحابہ کی فضیلت پر اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبیؐ کے جمال جہاں آراء کی تابانیوں سے آنکھیں منور کرنے کا موقع عنایت کیا۔ ان کی فیض بخش صحبت میں بیٹھنے کی فرصت ملی، دین وقرآن کو بلا واسطہ آپؐ کی زبان مبارک سے سنا خدا کے اوامر اور نہی کے یہ مخاطب اولین ہوئے اور اپنی جان و مال خدا کی راہ میں قربان کئے، یہ سب وہ فضائل اور امتیاز ہیں جن میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔

صحابی کون ہے؟: صحابی وہ ہے جس نے ایمان کی حالت میں آپ ﷺ کو دیکھا ہو، اگر چہ صرف ایک نظر ہی دیکھنے کا اس کو موقع ملا ہو اور پھر دنیا میں ایمان ہی پر اس کا خاتمہ بھی ہوا ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ صحابی وہ ہو سکتا ہے جس نے آپ ﷺ کے ساتھ طویل نشست و برخاست کی ہو۔ غزوات میں آپ ﷺ کے دوش بدوش لڑا ہو اور کم از کم چھ مہینے تو اس کو آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ کیونکہ اس سے کم مدت میں ساتھ رہنے والوں کو عرفاً مصاحب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ یہ علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ فضیلت اور شرف جو صحابیت کا ہے بس انہیں کو حاصل ہوگا۔ اس سے کم مدت میں ساتھ رہنے والے فضل و فضیلت کے اس نقطہ کمال تک نہیں پہنچ سکتے لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہی مختار ہے جس نے ایک نظر بھی آپ ﷺ کو دیکھ لیا وہ صحابیت کے شرف کو حاصل کر گیا۔ اس میں مدت کی تعین

نہیں ہے اور بات بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کے جمالِ دل فروز پر ایک نظر ہی ڈالنا وہ کام کرے گا اور ایمان ویقین کے وہ ساحل جلد جلد طے ہوں گے کہ دوسروں کی صحبت میں مدتوں کا بیٹھنا اور خلوت وجلوت میں ان کے ساتھ رہنا مفید نہیں ہوسکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضل وشرف میں جہاں تک ہم جانتے ہیں سوائے ابن عبدالبر کے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ ابن عبدالبر کی رائے ہے ممکن ہے کہ امت میں بعض افراد اور اشخاص ایسے پیدا ہوں جو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے جدوجہد کرتے ہوئے فضیلت اور کمال کے اس نقطہ تک پہنچ جائیں جہاں اصحاب النبیؐ کے بھی قدم نہ پہنچے ہوں۔ ابن عبدالبر اپنے اس دعوے پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے جس کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا اول اچھا ہے یا آخر بہتر ہے''۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ سے بعض صحابہؓ نے دریافت کیا ''یارسول اللہ! ہم آپ پر ایمان لائے۔ آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا، کیا کیا پھر بھی کوئی ہم سے افضل ہوگا''۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ہاں وہ لوگ تم سے بھی بہتر ہوں گے جو مجھ کو دیکھے بغیر ایمان لائیں گے'' اور ابن مسعودؓ فرماتے تھے کہ (ہمارا کیا کمال ہے اگر ہم ایمان لے آئے) کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت تو ایک حقیقت تھی جس نے آپ ﷺ کو دیکھا اور ایمان لے آیا اور اس پر کبھی فائق نہیں ہوسکتا، جس نے آپ ﷺ کو دیکھے بغیر آپ ﷺ پر ایمان لے آیا۔ بعض مفسرین ''یومنون بالغیب'' کی تفسیر انہیں احادیث اور اقوال سے کرتے ہیں اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ قرب قیامت میں ایک ایسا بھی وقت آئے گا جبکہ دین وسنت پر استقامت ایسی دشوار ہوگی جیسا کہ جلتے ہوئے شعلہ کو ہاتھ میں لینا مشکل ہے۔

لہٰذا جو شخص اس پر آشوب دور میں دین پر قائم رہے اس کو پچاس اشخاص کے برابر اجر ملے گا۔ اس پر صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! ان میں سے پچاس کے برابر یا ہم میں سے پچاس؟ آپؐ نے فرمایا تم میں سے پچاس کے برابر کہہ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن سے عبدالبر اپنے مرفوعہ کو ثابت کرتے ہیں لیکن عبدالبر کی

یہ رائے زیادہ صحیح نہیں ہے۔ علماء نے مختار قول، جمہور ہی کا قرار دیا ہے یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کوئی افضل نہیں ہو سکتا۔

اور احادیث میں فضیلت بعد میں آنے والوں کی بیان کی گئی ہے۔ وہ صرف ایمان بالغیب کی وجہ سے ہے۔ رہی عمومی فضیلت جو اپنی جگہ پر بڑی جامع ہے۔ صرف حضرات صحابہ ہی کو حاصل ہے۔ اور جزی فضیلت جامع فضیلت سے کوئی منافات نہیں رکھتی۔ ہاں ابن عبدالبر کی رائے کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید وہ ان صحابہؓ سے امت کے مخصوص افراد کو افضل سمجھتے ہیں جنہوں نے آنحضور ﷺ کو ایک نظر ہی دیکھا ہے۔ باقی وہ اصحاب جو دن رات آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ امت کے تمام افراد ان کی فضیلت اور شرف میں ابن عبدالبر کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ مگر اس کے باوجود پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آنحضور ﷺ کو ایک نظر دیکھنا بھی وہ فضیلت اور کمال ہے کہ کوئی بھی فضیلت اس کے ہم مرتب نہیں ہو سکتی۔ درآنحالیکہ اولیاء اللہ کو آنحضورؐ سے معنوی طور پر دائمی قربت رہتی ہے مگر وہ بھی مقام و منزلت میں ان سے فروتر ہیں جنہوں نے اپنے چشم سر سے آنحضورؐ کے رخ انور کو دیکھ لیا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

خلفاء اربعہ: آپ ﷺ کے چار خلفاء جو آپ ﷺ کے جانشین اور بڑے قریبی دوست و رفیق ہیں۔ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ صادق و مصدوق کی زبان مبارک سے ان کی منقبت میں اس قدر احادیث موجود ہیں اور ان کی اسلام کیلئے عظیم الشان خدمات اور ان کے اعلیٰ کارناموں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ کوئی صحابی بھی اس امتیاز میں ان کا شریک نظر نہیں آتا۔ احادیث و اخبار کے ایک سرسری جائزہ لینے سے بھی یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے فضل و کمال میں کسی بھی شبہ کا امکان نہیں ہے، ہاں دو باتیں اس جگہ قابل غور ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے بعد خلیفہ برحق جناب ابوبکر الصدیقؓ ہیں۔ ان کے بعد عمر فاروقؓ پھر عثمان غنیؓ اور سب سے آخر میں علی رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

خلافت کی یہ ترتیب اہل سنت والجماعت کے یہاں یقینیات میں سے ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بعض لوگوں کی رائے تو یہ ہے کہ آپ کی خلافت، صراحتاً احادیث سے ثابت ہے اور اہل سنت والجماعت کے علماء کہتے ہیں کہ آپ کی خلافت صحابہؓ کے اجماع سے ہے کیونکہ تمام اصحاب النبی رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ کی خلافت پر اتفاق کیا تھا، دنیا اور آخرت کے تمام معاملات میں وہ ان احکام کی پابندی کرتے تھے جن کا حکم حضرت ابو بکرؓ دیتے تھے۔ دراں حالیکہ صحابہؓ کے اس مقدس طائفہ میں حضرت ابو ذرؓ بھی تھے اور عمارؓ بھی، سلمانؓ بھی تھے اور صہیبؓ بھی، اور اس طرز کے سینکڑوں اکابر صحابہؓ موجود تھے جن کے بارے میں شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دین کے سلسلہ میں کسی قسم کی مداہنت کو برداشت کرتے۔ یہی وہ نامی گرامی جماعت ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ:

"لا یخافون لومة لائم"

"کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے"

اگرچہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ، عباس بن عبدالمطلبؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، مقداد ابن الاسود ایسے اکابر صحابہؓ نے انعقاد بیعت کے وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت نہیں کی تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ دوسرے وقت ان لوگوں نے بھی بیعت کر لی تھی۔ ابو بکرؓ نے ان کو خود بلایا اور بلا کر خطبہ پڑھا اور اس کے بعد فرمایا کہ یہ علیؓ ہیں، میں اپنی بیعت پر ان کو ہرگز مجبور نہیں کرتا اور نہ تم لوگوں کو، تم سب اپنے اپنے معاملہ میں مختار ہو، جو جی چاہے کرو، ہاں میری تم سے صرف اتنی عرض ہے کہ اگر تم لوگ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کو خلافت کا اہل سمجھتے ہو تو اس کو منتخب کر لو خدا کی قسم! سب سے پہلے میں اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ حضرت ابو بکر کی اس صاف بیانی پر سب سے پہلے علیؓ پھر ان کے بعد تمام جمع ہونے والے اصحاب بیک زبان بولے کہ اے ابو بکرؓ ہم تم سے زیادہ کسی کو افضل نہیں سمجھتے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب دین کے معاملہ میں خود آنحضور ﷺ نے آپ کو سب پر مقدم کر دیا (نماز کی امامت کی طرف اشارہ تھا جو صدیق

اکبرؓ نے آنحضورﷺ کے حکم سے آپﷺ کے مرض وفات میں کرائی تھی) تو اب کس کی جرأت ہے کہ آپ کو نظر انداز کر دے، ہاں ہم کو اتنی شکایت ضرور ہے کہ آنحضورﷺ کے عزیز و اقارب ہیں (اور خدا کا شکر ہے کہ زمانہ کے سرد و گرم چکھ کر ہم میں) مشورہ دینے کی صلاحیت بھی ہے، پھر ہمارے مشورہ کے بغیر خلافت کا معاملہ کیوں طے کر دیا گیا ہے (بہر حال یہ تو ایک دوستانہ شکایت تھی) لیکن اب تو آپ ہی کارِ عظیم کے سب سے زیادہ اہل ہیں اور ہم سب آپ کی خلافت پر بیعت کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر حضرت علیؓ اور آپ کے تمام ساتھیوں نے اسی وقت تمام حاضرین کے سامنے ابو بکر الصدیقؓ کی خلافت پر بیعت کر لی اور اس طرح خلافت کے مسئلہ پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو گیا۔ رہا حضرت علیؓ اور ان کے رفقاء کا تأمل اور تاخیر جو وہ محض معاملہ کی نوعیت پر خاص رجحانات کے تحت غور کرنے کیلئے کر رہے تھے وہ اس اجماع میں قادح نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے بیعت کرنے میں جو تاخیر کی اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ وفات کے روز آپ آنحضورﷺ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ اس قدر آپ کو مہلت نہ مل سکی کہ یہاں سے فارغ ہو کر فوراً ہی بیعت خلافت کرتے۔ پھر اس کے بعد آپ کی وفات کے حادثہ سے علی کچھ اس طرح دل شکستہ ہوئے کہ مدتوں گھر ہی میں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد کچھ غم دور ہوا اور طبیعت ذرا بہلی تو قرآن کے جمع و ترتیب کا مسئلہ آپ کے سامنے آ گیا اور آپ نے اپنی مخصوص بصیرت سے یہ فیصلہ کیا کہ خلافت کے مسئلہ سے زیادہ اہم جمع قرآن کا مسئلہ ہے۔ بہر حال ان اسباب کی بناء پر علی کرم اللہ وجہہ تقریباً چھ ماہ تک، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت نہ کر سکے اور چھ مہینے کے بعد جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو پھر حضرت علیؓ نے بیعت خلافت کی ہے لیکن یہ تحقیق درست نہیں ہے، صحیح یہی ہے کہ حضرت علیؓ نے اسی روز یا دوسرے روز بیعت کر لی تھی۔ واللہ اعلم حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت علیؓ تمام معاملات میں ابو بکر صدیقؓ کی پوری پوری اطاعت کرتے تھے۔ عیدین کی نماز، نماز جمعہ انہیں کی امامت میں ادا کرتے اور غزوہ بنی حنیفہ میں جس میں مسلمہ کذاب مارا گیا ہے۔ حضرت علیؓ شریک تھے

اور ایک باندی بھی مالِ غنیمت میں ان کو ملی تھی۔ اگر یہ غزوہ امام برحق کی نگرانی میں اور حکم سے نہیں ہو رہا تھا تو کیا کوئی مسلمان اس سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں کسی قسم کا تصرف کرسکتا ہے؟ کسی بھی عقلمند کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ علیؓ جو شیر خدا امام اولیاء اور مرکز دائرہ حق تھے اور جن کے ساتھ قرآن تھا اور خود وہ قرآن کے ساتھ، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ ہیں اپنی تمام عمر میں، نماز جیسی اہم عبادت اور مالی اور بدنی طاعات، ایک ظالم کے تحت کرتے رہیں اور ان کو یہ بھی یقین ہو کہ حق پر میں ہوں، آنحضورؐ سے کوئی صریح حکم اپنی خلافت کے سلسلہ میں سنا ہو اور پھر خلافت حاصل کرنے کیلئے کھڑے نہ ہوئے ہوں اور اس طرح خاموش رہ کر مدت العمر ارباب ہوا و ہوس اور اہل باطل کے ہاتھوں میں گرفتار رہے ہوں (اگر علیؓ اس قدر خاموش رہنے والے آدمی تھے) تو معاویہؓ سے جو ناحق علیؓ سے لڑ رہے تھے اور ان کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے کیوں جنگ کی اور کس لئے ان پر دلائل سے غلبہ حاصل کیا۔ یہی علیؓ ہیں جو قسم کھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس ذات کی قسم! جس نے سب کو پیدا کیا اور جو تخم کو زمین سے نکالتا ہے اگر آنحضور ﷺ مجھے کوئی عہد کرتے یا خلافت کے سلسلہ میں مجھ کو کوئی حکم عنایت فرماتے اور میری شکستہ حالی کا یہ حال ہوتا کہ سوائے اس چادر کے جو میرے جسم پر ہے اور کوئی چیز میرے پاس موجود نہ ہوتی تب بھی میں ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) کو آنحضورؐ کے ممبر کے کسی بھی حصہ پر ہرگز نہ چڑھنے دیتا لیکن جب آپؐ نے میرے ہوتے ہوئے مجھ کو خوب جانتے پہچانتے ہوئے ابوبکرؓ کو امامت کا حکم دیا تو اب ان سے لڑنے کیلئے میرے پاس کیا دلیل ہے۔ جب آپ ﷺ ہی نے ابوبکرؓ کو دین کے معاملہ میں ہمارا امیر بنا دیا تو دنیا کے امور میں انہیں کو اپنا امیر بنانا بہت مناسب اور بہتر ہے، (یہ ہے علی کرم اللہ وجہہ کی حق پژوہی و حق پسندی) لیکن اہل تشیع پھر بھی کہتے ہیں کہ ان کی یہ تقریر تقیہ کے طور پر تھی۔ حالانکہ نہیں سمجھتے کہ تقیہ کا شبہ بھی حضرت علی کی مذمت ہے جس کے مرتکب شعوری یا غیر شعوری طور پر اہل تشیع ہو رہے ہیں۔

اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ علیؓ اپنے دشمنوں سے مرعوب ہو گئے، اپنی جان کے خطرہ

سے ششدر ہو گئے اور ایک واقعی حق کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکے ظلم وغضب کو دیکھتے رہے اور چپ بیٹھے رہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ علیؓ جو یقین وایمان کے پہاڑ تھے، آنحضورﷺ سے اپنی خلافت کے متعلق صاف طور پر سن لیتے اور دین کے احکام کے نفاذ اور ملت کی گاڑی کو کھینچنے کی ذمہ داری ان پر عائد کی جاتی اور پھر وہ ان موہوم خطرات کی وجہ سے چپ ہو رہتے تھے نعوذ باللہ۔ اور پھر تقیہ کی تو ان لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے جو حق پر ہونے کے باوجود نہایت کمزور اور فلاکت زدہ ہوں جن کا نہ کوئی حامی ہو نہ ہمدرد۔ علیؓ اپنی ذاتی شجاعت وجرات کے علاوہ توکل اور اعتماد علی اللہ کے کامل مظہر تھے۔ رسول اللہﷺ کی صاحبزادی فاطمۃ الزہراؓ، ان کے نکاح میں تھیں (جن کے اشارہ چشم وابرو پر پوری امت، علی کی حمایت میں کھڑی ہو جاتی) حسنؓ وحسینؓ ایسی اولاد کے باپ تھے جن سے آنحضورﷺ کا تعلق قلبی مشہور تھا (جو امت کی کشش کیلئے ایک بڑا قومی سبب بن سکتا) عباسؓ رسول اللہﷺ کے چچا اپنی تمام طاقت کے ساتھ علیؓ کے بہی خواہ تھے۔ زبیر رضی اللہ عنہ جو عزم وارادہ کے پہاڑ اور عرب کی مخصوص طاقت کے مالک تھے۔ علیؓ کے حامی، پورا بنو ہاشم اپنی شہرت اور بہادرانہ روایات کے ساتھ علیؓ کی مدد پر، پھر ان تمام اسباب کے ہوتے ہوئے، بزدلی اور جبن کا کیا مطلب اور حضرت علی کو تقیہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ مشہور روایت ہے کہ جس زمانہ میں علیؓ نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی تو ان سے عباسؓ نے کہا کہ علیؓ! ہاتھ لاؤ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، دنیا جب یہ دیکھے گی کہ رسولؐ کے حقیقی چچا نے رسول کے چچازاد بھائی (یعنی علیؓ) کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی ہے تو کسی کو بھی آواز اٹھانے تک کی جرات نہ ہوگی اور یہ بھی مشہور ہے کہ اسی عرصہ میں سفیان اموی نے بھی حضرت علیؓ سے ایک دن (اشتعال انگیز لہجہ میں) کہا کہ اے عبد مناف تم ایک تمیمی شخص کی اطاعت پر کیوں تیار ہو گئے (ابوبکر کی طرف اشارہ تھا جو کہ بنو تمیم میں سے تھے) حالانکہ یہ تمیم والے تم قریشیوں سے ذلیل ہیں، خدا کی قسم اگر تم ان سے لڑنے کا ارادہ کر لو تو پیدل اور سوار لوگوں کی اتنی بڑی تعداد لا کر جمع کر دوں گا کہ یہ سامنے والی وادی انسانوں سے بھر جائے گی اور ان تمیم والوں کے کشتوں کے

پیشتے لگادوں گا۔

لیکن علی نے ڈانٹ کر کہا اے دشمن اسلام یہ کیا باتیں ہیں؟ کیا تو مسلمانوں میں کسی بڑے فتنہ کے اٹھانے کے سامان کر رہا ہے؟ اور تو اور یہ شیعہ تو تقیہ کو انبیاء کیلئے نہ صرف جائز بلکہ خطرات کے مواقع پر واجب قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ خطرات کے مواقع پر انبیاء کیلئے جائز ہے کہ وہ کفر کا اظہار کر کے اپنی جان چھڑا لیں۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ علیؓ نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں امام تسلیم کر رکھا تھا لیکن خوف کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کر سکے جب یہ حضرات انبیاء اور آنحضور ﷺ کے بارے میں اس قسم کی لغو باتیں کرتے ہیں ''تا بدیگراں چہ رسد'' اور اب ان سے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

حالانکہ اگر انبیاء بھی کتمانِ حق کرتے ہیں تو پھر اس زمین کے اوپر کون ہے جو حق کو قائم کرے گا۔ نوح کی قوم سے زیادہ متکبر کون ہوگا؟ نمرود سے بڑھ کر سرکشی کس نے کی ہے؟ فرعون کے مظالم کا جواب تاریخ کا ہے کو پیش کر سکے گی مگر اس کے باوجود نوح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام نے کیا اظہار حق سے پہلو تہی کی؟ معاذاللہ۔

بہر حال ان گوناگوں وجوہات کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ ابو بکر کی خلافت پر تمام صحابہؓ نے اتفاق کیا اور جس امر پر صحابہؓ یا اس امت کے علماء اتفاق کر لیں وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ اگرچہ اس اجماع میں شریک ہونے والا ہر فرد انفرادی طور پر ''**المجتهد يخطئ ويصيب**'' (یعنی مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور اس سے درستگی بھی ظاہر ہوتی ہے) کی رو سے غلطی سے مبرا نہیں ہے لیکن جب یہ سب مل کر کسی معاملہ پر اجماع کر لیں تو پھر ان کے اجماع کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ صحیح ہوگا غلط نہ ہوگا کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ

لتكونوا شهداء على الناس.

''کہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر''

اور یہ بھی ہے کہ:

ويتبع غير سبيل المومنين.

''اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے''

سوااس کے ساتھ یہ حدیث بھی ہے کہ ''میری امت اجتماعی طور پر کسی گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ جب بھی اجماع کرلیں تو وہ ٹھیک ہی ہونا چاہئے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام صحابہؓ یا اکثر نے ابو بکرؓ کی خلافت کو ناجائز سمجھتے ہوئے پھر عمداً سکوت کیا، نبی کے حکم کی مخالفت کی اور کھلے ظلم کا ارتکاب ان سے ہوا تو پھر آپ بتائیے کہ اس واہمہ کو امکان و وہم ہی کے درجہ میں رکھنے سے کیا کیا فساد رونما ہوں گے۔ یاد رکھئے کہ اگر اس قسم کے امکانات مان لئے گئے تو دین وملت کی کوئی بات بھی اپنی جگہ درست نہ رہ سکے گی اور کسی بھی قانون شرعی کے صحیح ہونے کا اطمینان باقی نہ رہے گا۔ قرآن اور شریعت کے قانون، دین کے کلیات وجزئیات، صحابہ ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں اور جب یہی طائفہ تمہارے نزدیک فاسق، ظالم، فاجر اور حق کو چھپانے والا ہے تو پھر بتاؤ کہ ان لوگوں کے ذریعہ منتقل ہونے والے دین وشریعت کی صحت کی کیا ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اتنا تو سوچنا چاہئے تھا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی بھی عیب اور برائی نہیں ہوسکتی۔

نعوذ باللہ من الجہالۃ الضلالۃ والغباوۃ.

امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی بعض تصانیف میں قرآن کریم کی اس آیت:

لا یحطمنکم سلیمان و جنودہ وھم لا یشعرون.

نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اس کے لشکر اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔

سے بعض دلچسپ استنباط کیے ہیں۔

رازیؒ لکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے چیونٹے رافضیوں سے زیادہ عقل مند تھے۔ دیکھو بعض چیونٹیاں دوسری چیونٹیوں سے بولیں کہ اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کا لشکر غیر دانستہ تم کو ہلاک و پائمال کردے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس ضعیف مخلوق نے کیا اہتمام کیا اور اس کو پسند نہ کیا کہ نبی کے لشکر سے نادانستہ بھی خدا کی کسی مخلوق پر ظلم ہو اور یہ روافض کہتے ہیں کہ اصحاب النبی رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دیدہ و دانستہ علیؓ پر ظلم کیا اور ان کے حق کو سلب کر بیٹھے اور یہ نہ سوچا کہ نبی کے اصحاب سے

ظلم و عدوان، دوسروں کے حقوق تلف کرنا، سخت مذموم و مکروہ ہے۔ لہٰذا ان کی طرف ایسے گندے الزامات کی نسبت کرنا بہت بڑا اور غیر مناسب اقدام ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ کے اجماع سے بڑھ کر کوئی بھی طاقت ور دلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ دین وملت کے پاسباں اور احکام شریعت وسنت کے ترجمان ہیں اور اگر انہوں نے حضرت علیؓ کے حق کو سلب کیا اور پھر علیؓ نے ان کی متابعت کی تو اس سے بڑھ کر علیؓ پر کوئی الزام نہیں ہوسکتا کیونکہ اب تو علی پر لازم تھا کہ وہ ایسے ظالموں کے خلاف بھرپور اقدام کریں اور جب وہ خاموش کھڑے دیکھتے تو دوسروں کا نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) یہ خود علی کا سب سے بڑا جرم ہوگا۔ ذرا گہری نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے اگر آپ بھی سوچیں تو معلوم ہوگا کہ علی کے جتنے فضائل ہیں وہ سب کے سب ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کی صحت اور حق بجانب ہونے کے بڑے سے بڑے دلائل ہیں کہ علیؓ نے باوجود اس قدر امتیاز وخصوصیات کے کوئی تو بات ہوگی کہ ابو بکرؓ کی اتباع کی اور ان کی خلافت پر بیعت کر کے ان کی خلافت کے استحکام کے باعث بنے۔ واقعی علیؓ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے خلافت کے استحکام کا ایک قوی سبب تھے۔ یہ صرف ہم ہی نہیں کہتے بلکہ خود علیؓ بھی اسی قسم کی باتیں کہا کرتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ علیؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ امیر المومنین! اس کی کیا وجہ ہے کہ تین خلفاء کا دور امن واطمینان سے گزر گیا نہ ہنگامے تھے نہ شعور وغوغا، نہ فتنہ وفساد تھا نہ قتل وقتال کے معرکے اور آپ کا زمانہ آیا تو ہنگامے ابل پڑے اور فتنے جاگ اٹھے۔ آخر یہ کیا وجہ ہے اور ایسا کیوں ہوا؟

علیؓ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اس تفاوت کی وجہ یہ ہے کہ ان خلفاء کی پشت پناہی کیلئے ہی ایسے موجود تھے اور ہماری خلافت کے تزلزل اور کمزوری کا راز یہ ہے کہ ہماری حمایت تم لوگ کرتے ہو اور ابھی تو پھر بھی غنیمت ہے۔ آئندہ دیکھنا کیا ہوگا (سوچنے کا موقع ہے کہ علیؓ نے دیدہ ودانستہ ظالمین کی خلافت کا استحکام کیوں کیا؟)

حاصل کلام یہ ہے کہ عقل صحابہ کے اجماع کو قبول کرتی ہے اور عقل اس کا انکار کرتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے صرف انہیں دس بارہ صحابہ کی تربیت کی ہو جنہوں نے ابو بکرؓ کی

خلافت پر بیعت کرنے میں تامل کیا تھا اور باقی اصحابؓ ظلم پیشہ اور ستم شعار ہوں۔ دوسروں کے حقوق کو ہضم کرنے کے عادی ہوں۔ معاذ اللہ،

فرقہ زیدیہ: یہ فرقہ شیعوں کے تمام گروہ میں سب سے زیادہ سلیم اور صالح سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ خلافت کا صحیح حق تو آنحضورؐ کے بعد حضرت علی ہی کو حاصل تھا لیکن مصلحت یہ تھی کہ ابو بکر کو ہی خلیفہ بنا دیا جائے۔ کیونکہ وہی ہنگامے سر اٹھا رہے تھے اور سوئے ہوئے فتنے جاگ رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں اگر علی خلیفہ ہو کر اس کی ذمہ داریوں میں لگ جاتے تو خواہ مخواہ اسلام کی تلوار نیام میں ہوتی اور خدا کا شیر، کچھار میں محو خواب ہوتا اور اس سے اسلام کو وہ نقصان پہنچتا جس کی تلافی بھی ممکن نہ تھی۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ علی میدان میں دشمنان دین کا سر اتارتے رہیں اور ابو بکر ملکی و ملی نظم کو سنبھال کر، اٹھنے والے ہنگاموں کو فرو کرتے رہیں۔ زیدیہ کی یہ اپج دراصل اس خیال پر قائم ہے کہ خلیفہ افضل ہونا چاہئے اور علیؓ، ابو بکرؓ سے افضل تھے لیکن علماء اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ خلیفہ کیلئے افضل ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ بس اتنا ہونا کافی ہے کہ وہ قریش میں سے ہو، حلال و حرام کے علم کو جانتا ہو، متقی اور پرہیزگار ہو، انصاف پسند اور بہادر ہو، دین کے مصالح کی رعایت کرسکتا ہو اور ملت کی گاڑی کو کھینچنے کی اس میں صلاحیت ہو اگر یہ خصوصیات اس میں موجود ہیں اور پھر وہ اپنے زمانہ میں سب سے افضل نہ ہو تو اس کو خلیفہ متعین کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ خصوصیات و صفات جو ہم نے ایک خلیفہ کیلئے ضروری بتائی ہیں ابو بکرؓ میں درجہ بدرجہ تمام موجود تھیں، ان کی سیرت اور عادت، صفات و خصائل کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان کے پیش نظر ابو بکرؓ کے استحقاق خلافت کا فیصلہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ خلافت

ایک رائے: بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے سلسلہ میں واضح طور پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا تھا لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں یہ تحقیق قرین صواب نہیں ہے۔ صحیح وہی ہے کہ آنحضور ﷺ سے نہ تو حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں کوئی صراحت ملتی ہے اور نہ حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلہ میں کوئی تصریح ہے۔ اگرچہ دونوں فریق اپنے اپنے استحقاق پر اس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے دلائل کو توڑتے بھی ہیں لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اگر حضرت علیؓ کیلئے آپ کا کوئی واضح ارشاد موجود ہوتا تو پھر ابوبکرؓ کی خلافت پر تمام صحابہؓ اتفاق کیوں کرتے اور خود حضرت علیؓ سے سکوت ناممکن تھا۔ کیونکہ نص کے ہوتے ہوئے حضرت علیؓ کا سکوت ایک بڑا جرم ہے جس کا ارتکاب حضرت علیؓ سے یقیناً بعید ہے اور اسی طرح اگر حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں آپ کھل کر فرمادیتے کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکرؓ ہی ہوں گے تو خلافت کے انعقاد کے وقت میں انصار کا یہ کہنا کہ ایک امیر ہم میں سے ہونا چاہئے اور ایک تمہارا کیا مطلب رکھتا ہے، یقیناً اگر ایسی کوئی تصریح موجود ہوتی جس سے حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے کا اظہار ہوتا تو بنوسقیف ساعدہ میں بحث ومباحثہ کا کوئی بھی موقع نہ تھا اور جبکہ اس مسئلہ پر ردوقد ہوا تو یہی اس کی علامت ہے کہ کم از کم خلافت کے مسئلہ میں نہ علیؓ کے پاس آپ کا کوئی ارشاد تھا اور نہ ابوبکرؓ کیلئے آپ کا کوئی فرمان موجود تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ بنوساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر جو نرم وگرم گفتگو ہوئی اس کا پس منظر یہ تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں جو آنحضور ﷺ کے

ارشادات تھے ان سے صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت ناواقف تھی لہٰذا اس کنج وکاوش کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کے وہ ارشادات سامنے آجائیں اور ہر ایک شخص خلافت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے نظریات سے واقف ہو جائے۔ لیکن اس توجیہ پر پھر وہی ذہنی اشکال پیش آئے گا کہ آخر جب بحث وتمحیص کے بعد آپ ﷺ کے وہ ارشادات سامنے آگئے تو پھر حضرت علیؓ نے اختلاف کیوں کیا اور خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت قبول کرنے میں حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کو کیوں اختیار دیا۔ بلکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہ بن جرل رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پکڑے اور انصار کی طرف خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ خلافت اور امامت کا حق تو صرف قریش ہی کو ہے، اب تم ان دونوں میں سے کسی کو اپنا امیر منتخب کرلو، میں بھی اسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابو بکر کو اپنی خلافت کے سلسلہ میں کوئی واضح ارشاد حاصل تھا تو عمر بن خطابؓ اور ابو عبیدہ کو منتخب کرنے کا سوال اٹھانا کس حد تک صحیح تھا؟ اس لئے ان گوناگوں اشکالات سے محفوظ رہنے کا وہی راستہ ہے کہ آپ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت صرف اجماع سے تسلیم کریں اور اصول فقہ میں یہ طے ہے کہ اجماع کیلئے کوئی سند کافی ہونی چاہئے اور سند ظنی اور غیر قطعی، اجماع کی تاکید کیلئے بلاشبہ ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے اور خلافت کے مسئلہ پر دونوں جماعتوں نے کافی حد تک اختلاف کیا ہے۔ اپنے استحقاق پر بڑے دلچسپ دلائل اور سنہری موشگافیاں کی ہیں۔ یہ تمام تر بحث و مباحثہ ہماری اس تالیف کے مقصد سے دور کی چیز ہے۔ اس لئے ہم نے مختصر طور پر اس بحث کو سمیٹ لیا۔ تفصیلات کیلئے ہماری ایک مستقل تصنیف کا انتظار کیجئے۔ **واللہ الموفق وبہ نستعین۔**

خلافت فاروقیؓ: اس تفصیل کے نتیجہ میں آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ابو بکر کی خلافت اجماع سے قائم ہوئی اور وہ خلیفہ برحق ہیں۔ لہٰذا حضرت ابو بکرؓ کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب تھی۔ اس لئے انہوں نے جب وفات کے وقت اپنی صوابدید سے حضرت عمر

فاروقؓ کو خلیفہ متعین کر دیا اور ایک تحریر لکھی جس میں حضرت عمرؓ کی خلافت کی وصیت تھی۔ اس پر تمام صحابہ نے اور حضرت علیؓ نے بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خلافت بھی ابوبکر صدیقؓ کی طرح اجماع ہی سے قائم ہوئی ہے۔

خلافت عثمانیؓ: پھر حضرت عمرؓ نے شہادت کے وقت چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی جو حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، طلحہؓ زبیرؓ سعد بن وقاصؓ پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کے سپرد خلیفہ کے انتخاب کا کام کیا گیا تھا، پھر اس کمیٹی کے تمام افراد نے بالاتفاق خلیفہ کے انتخاب کا حق تمام تر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو دے دیا۔ جب عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اور امیر منتخب کیا تو ان کے ہاتھ پر بشمول علی کرم اللہ وجہہ تمام صحابہؓ نے بیعت کر لی اور دین و دنیا کے معاملات میں ان کو اپنا امیر تسلیم کر لیا اس طرح حضرت عثمانؓ کی خلافت کا قیام بھی اجماع ہی سے ہوا۔

علیؓ اور ان کی خلافت: حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد علی کرم اللہ وجہہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اور تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ افضل اور اشرف ہونے کی بناء پر خلافت کے صحیح مستحق اور اہل تھے۔ اس لئے وہ حضرت عثمانؓ کے بعد صحابہؓ کے متفقہ فیصلہ سے خلیفہ ہو گئے اور اہل مشورہ اور ارباب انتظام نے ان کی خلافت پر کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا۔ جو جھگڑے ان کی خلافت کے زمانہ میں پیش آئے وہ حضرت عثمان کے قاتلوں سے انتقام کے مطالبہ اور رائے کی غلطی کی بنا پر تھے۔ یہ اختلافات اس بنا پر ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ سے لڑنے والے حضرت علیؓ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ہرگز نہیں وہ سب کے سب حضرت علیؓ کو خلافت کا واقعی اہل جانتے تھے لیکن ان کے جھگڑوں کا پس منظر اجتہادی غلطی اور وہ محرکات وعوامل تھے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہاں ہماری ایک بحث ختم ہوئی اس کے بعد ایک دوسرے نقطۂ نظر کا ہم آغاز کرتے ہیں۔

ایک اور بحث: دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ خلفاء اربعہ کی فضیلت خلافت

کی ترتیب کے مطابق ہے یعنی سب سے زیادہ افضل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ ان کے بعد عثمان غنیؓ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں (یہی ان چاروں میں خلافت کی ترتیب بھی ہے سب سے پہلے ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے اور اس کے بعد عمرؓ پھر عثمانؓ اور پھر علی کرم اللہ وجہہ۔ دوسری بات یہ ہے کہ افضلیت سے یہاں کثرت ثواب مراد ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم یوں کہتے ہیں کہ زید عمر کے مقابلہ میں افضل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم زید کو عمر کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ اب کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ زید اپنی تمام صفات میں عمر سے افضل ہے جب بھی زید کی خصوصیات اور صفات کا عمر کی صفات سے موازنہ کیا جائے تو زید کی صفات عمر کی صفات کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہوں گی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زید کو عمر کے مقابلہ میں مجموعی حیثیت سے افضل قرار دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ عمر اپنی کسی خاص صلاحیت کے گوشہ میں زید سے کامل ہو لیکن عمر کی تمام صفات کا مجموعہ زید کی صفات کے بالمقابل بہرحال ہلکا ہوتا ہے۔ جب آپ یہ سمجھ گئے تو اب دیکھئے خاص اس آخری فضیلت کے سلسلہ میں اختلاف ہے یعنی ثواب اور اجر کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی شخص کیلئے کثرت، دوسرے اسباب کی بنا پر ہو مثلاً کوئی شخص بہت بڑا عالم ہو اور اس نے اپنے علم سے دنیا کو فائدہ پہنچایا ہو تو اس وجہ سے اس کا ثواب اور اجر بڑھ جائے یا شرف نسب کی بنا پر یا ملکی قوتوں کی وجہ سے مثلاً شجاعت وغیرہ جیسی صفات جن کو عام طور پر فضیلت کا باعث سمجھا جاتا ہے بہرحال ان صفات کی وجہ سے ثواب اور اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑھ سکتا ہے اور یہ چیزیں ایسی ہیں کہ عمر میں ہوں زید میں نہ ہوں لیکن پھر بھی زید اپنی مجموعی صفات کے اعتبار سے عمر پر فائق ہو۔

اور کثرت اجر و ثواب کے اصل اسباب وہ فضائل اور کارنامے ہیں جن کا نفع اسلام کو پہنچا ہو۔ مثلاً کسی خوش بخت نے سب سے پہلے اسلام کو قبول کیا ہو یا دین کی نصرت اور تقویت اس سے ہوئی ہو یا پھر مسلمانوں کی امداد کثرت سے اس نے کی، خیرات کے دروازے کھول دیئے لوگوں کی راہنمائی کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا یہ

سب چیزیں اجر و ثواب کا بلاشبہ باعث ہیں اور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ تمام صفات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میں نہایت قوت کے ساتھ جمع ہو گئی تھیں کیونکہ وہ جب سے ایمان لائے اسی وقت سے، ان کا وجود دین اور اسلام کی نصرت وقوت کا باعث بنا رہا ہے اور لوگوں کو برابر اسلام کی وہ دعوت دیتے رہے۔ خود عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عثمان بن مظعونؓ ایسے جلیل القدر صحابہؓ اور اکابر مہاجرین، حضرت صدیق اکبرؓ ہی کی کوششوں سے انہیں کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ اپنی زندگی میں آنحضور ﷺ کی حیات اور آپ کی وفات کے بعد اسلام کی طاقتوں کو وسیع تر کرنے کی فکر میں رہے اور کفر کی بیخ کنی ان کا وظیفہ رہا ہے۔ ابتداء اسلام میں جب کسی بہادر سے بہادر کو بھی اسلام کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی ابو بکرؓ نے اپنے مکان پر ایک مسجد بنائی اور وہاں قرآن کی تلاوت کرتے۔ پھر اس خوش الحانی کے ساتھ قریش کی عورتیں اور بچے آکر جمع ہو جاتے۔

بہر حال یہ ابو بکرؓ کے فضائل ہیں ان میں ان کا کوئی بھی شریک نہیں یہ تو تمہید تھی، اب اصل بات سنئے۔ وہ یہ کہ جمہور علماء اہل سنت والجماعت کا یہی خیال ہے کہ ان چاروں خلفاء میں، فضیلت کی ترتیب اسی طرح ہے جیسا کہ خلافت کی ترتیب تھی لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ آنحضور ﷺ کے بعد افضل کون ہے؟ تو فرمایا کہ ابو بکرؓ۔ سائل نے دریافت کیا پھر ان کے بعد؟ تو امام نے جواب دیا کہ عمر رضی اللہ عنہ۔

سوال کرنے والے نے اب دریافت کیا کہ اچھا حضرت عثمانؓ اور علی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو امام نے اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم جن اسلاف کے متبع ہیں ان کو ہم نے دیکھا کہ وہ عثمانؓ اور علیؓ کے بارے میں خاموش رہتے اور توقف کرتے تھے۔ اس لئے ہمارا بھی یہی مذہب ہے کہ ان دونوں شخصیتوں کے حق میں توقف ہی مناسب ہے۔ امام الحرمین کا رجحان بھی امام مالکؒ ہی کے مذہب پر ہے لیکن ابو بکر بن خزیمہ، حضرت علی کو عثمان پر فضیلت دیتے تھے جیسا کہ ''جواہر الاصول'' میں لکھا ہے کہ کوفہ والے حضرت علی کو حضرت عثمان پر فضیلت دیتے ہیں اور ابو بکر بن خزیمہ کا

بھی یہی مذہب ہے اسی کے قریب شیخ ابو عمرؒ بن اصلاح نے اپنے مقدمہ میں تحریر کیا ہے اور سفیان ثوری کی تصریحات سے بھی یہی رجحان مترشح ہوتا ہے۔

علماء حدیث میں سے جو لوگ حضرت علی کو عثمانؓ پر فضیلت دیتے ہیں ان میں سے محمد بن اسحاق ابن خزیمہ ہیں لیکن امام نوویؒ نے مسلم شریف کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض کوفہ والوں کا خیال ہے کہ علیؓ! عثمانؓ کے مقابلہ میں افضل ہیں۔ حالانکہ یہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ عثمانؓ ہی علیؓ پر افضل ہیں۔ ''قسطلانی'' نے اتنی بات اور لکھی ہے کہ سفیان ثوریؒ نے بھی آخر میں اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا تھا کہ علیؓ عثمانؓ سے افضل ہیں اور بیہقی کتاب الاعتقاد میں لکھتے ہیں کہ علماء سنت والجماعت میں حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بارے میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے سب کہتے ہیں کہ ابو بکرؓ عمرؓ کے مقابلہ میں افضل ہیں۔ ہاں اگر اختلاف ہے تو عثمانؓ اور علیؓ کے سلسلہ میں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ تو بہر حال ساری امت سے افضل ہیں لیکن اس کے بعد پھر اختلاف شروع ہوتا ہے کہ کون افضل ہے اور کون نہیں۔ قصیدہ امالیہ کی شرح میں یہ بھی تصریح ہے کہ خلفاء اربعہ کی فضیلت، اولاد نبی کے علاوہ دوسرے لوگوں پر ہے۔ پیغمبر کی اولاد ان چاروں سے بھی افضل ہے۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ابو بکر اور علی کے بارے میں اختلاف کیا ہے اور ابن عبدالبرہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ ابوذرؓ مقداد، خبابؓ، جابرؓ، ابو سعید خدریؓ، زید بن ارقمؓ سے نقل ہے کہ حضرت علیؓ سب سے پہلے اسلام لائے لیکن ابو طالب کے خوف سے اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔

ابن عبدالبر اس کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ صحابہ کی یہ جماعت جن کے اسماء گرامی کا ذکر گزرا، حضرت علیؓ کو تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر فضیلت دیتے ہیں۔

لیکن علماء نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ابن عبدالبر کی یہ تحقیق غیر مقبول بلکہ مردود ہے جو تحقیق اجماع کے خلاف ہو اور جمہور کے بالکل مخالف اس کو ہرگز سنا نہ جائے گا۔

ابن عبدالبر نے جن اکابر صحابہؓ کے اسماء گرامی پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ حضرت علی کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتے تھے۔ تاج الدینؒ سبکی جو شافعی عالم ہیں اپنی

تصنیف خصائص کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ یہ فضیلت صرف حضرت علیؓ ہی کو نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ کو بھی دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ دونوں حضرات آنحضور ﷺ کے داماد ہیں اور ان کا آپؐ سے جزئیت کا علاقہ اور اتحاد ہے۔ سیوطیؒ نے امام علیم الدین عراقی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور ان کے بھائی ابراہیم چاروں خلیفاء سے افضل ہیں۔ امام مالکؒ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہم جگر گوشہ رسولؐ پر کسی کو بھی فضیلت نہ دیں گے۔

بہر حال یہ تمام اقوال شیخین کی فضیلت کو ختم نہیں کرتے کیونکہ شیخین کو ایک عمومی فضیلت حاصل ہے اور ان حضرات کو خاص فضیلت سے سرافراز کیا گیا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ جزئی فضیلت کلی فضیلت کے منافی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اولاد النبی ﷺ کو جو فضیلت حاصل ہے وہ آپؐ کے جز ہونے کی بنا پر ہے یہ فضیلت کثرت ثواب اور اسلام اور اہل اسلام کو زیادہ نفع پہنچانے کی وجہ سے نہیں ہے اور اس میں کون شبہ کرسکتا ہے کہ آپ کی اولاد جگر گوشوں کو ایک ایسا شرف اور کرامت حاصل ہے جو شیخین کو حاصل نہیں ہے۔ اس کا نہ کوئی انکار کرسکتا ہے اور نہ کسی کو انکار کرنا چاہئے۔ ہاں شیخین کی فضیلت یہ ہے کہ ان سے اسلام اور مسلمانوں کو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے اور بلاشبہ ان کے اس امتیاز میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔

خطابیؒ نے اپنے بعض مشائخ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "ابو بکرؓ، علیؓ سے بہتر ہیں اور علیؓ ابو بکرؓ سے افضل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں افضیلت اور حرمت سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر علیؓ افضل ہیں اور بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر ابو بکرؓ بہتر ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کون اختلاف کرسکتا ہے ہم خود ہی کہہ چکے ہیں کہ ایسا نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے اور اگر بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ابو بکرؓ کو ثواب زیادہ ملے گا اور ان کی عظیم خدمات کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ہے اور رہے علی تو اپنے حسب و نسب اور آنحضور ﷺ سے قریبی تعلق کی وجہ سے ایک شرافت اور کرامت کے مستحق ہیں تو اس سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا ہے لیکن اگر خطابی اور ان کے مشائخ کا کوئی اور مطلب ہے تو جب تک وہ بیان نہ کیا جائے ہم اس کا کیا جواب نہیں دے سکتے ہیں۔

ایک دوسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ افضلیت کی ترتیب، خلافت کی ترتیب کی طرح قطعی و یقینی ہے، یا ظنی ہے کہ اس کے دلائل صرف کچھ علامتیں اور قرائن ہیں؟ بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ افضلیت کی ترتیب بھی خلافت کی ترتیب کی طرح یقینی ہے لیکن اکثر محققین کی رائے یہی ہے کہ قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ امام الحرمین نے ارشاد میں اس بحث کو چھیڑا ہے اور سوال کے طور پر دریافت کیا ہے اور پھر خود ہی لکھا ہے کہ فاضل کے ہوتے ہوئے غیر فاضل کو امام بنانا صحیح نہیں ہوتا ہے لیکن اہل سنت والجماعت کی رائے یہ ہے کہ امام افضل ہی ہونا چاہئے لیکن اگر اس کی امامت سے کسی بڑے فتنہ کے سر اٹھانے کا خطرہ ہو تو پھر مفضول کو بھی امام بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس مفضول میں امامت کی شرائط موجود ہوں، یعنی وہ قریشی ہو، حلال اور حرام کا علم رکھتا ہو، بہادر ہو، متقی ہو، اسلام کی مصالح کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ امام الحرمین نے خود اپنی رائے یہ پیش کی ہے کہ افضل کو امامت کیلئے متعین کرنا میرے نزدیک قطعی نہیں ہے۔

کیونکہ ہماری بحث تو امامت کبریٰ کے بارے میں ہے اور احادیث امامت صغریٰ (نماز) کے سلسلے میں ملتی ہیں اور پھر وہ بھی احاد ہیں۔ اس لئے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امامت اور خلافت کیلئے افضلیت شرط نہیں ہے۔ لہٰذا جو بعض ائمہ کو دوسروں پر فضیلت اور ترجیح دی جا رہی ہے اس کیلئے کوئی قاطع دلیل تو ہے نہیں اور احادیث جو فضیلت کے سلسلہ میں روایت ہیں وہ ایک دوسرے کے معارض ہیں اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم سکوت اور توقف سے کام لیں زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے بعد ابو بکرؓ افضل ہیں، اس کے بعد عمرؓ اور عثمان و علی رضی اللہ عنہما کے سلسلہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ خود علی کرم اللہ وجہہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ آنحضور ﷺ کے بعد سب سے زیادہ افضل ابو بکرؓ ہیں اور ان کے بعد عمرؓ اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون افضل ہے اور کون نہیں۔ یہاں تک ہم نے امام الحرمین کی تحقیق کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا ہے۔ امام الحرمین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تحقیق ہم کو پسند ہے اور تقلید کی راہ سے ہٹ کر ہم نے تمام گوشوں پر غور کرنے کے بعد قائم کی ہے۔ مدینہ کے بعض فقہاء شرح قصیدہ امالیہ میں لکھتے

ہیں کہ شیخ احمد زروق جو مغربی عالم ہیں عقیدہ حجۃ الاسلام کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فضیلت قطعی ہے یا ظنی؟ اشعری کہتے ہیں کہ قطعی ہے اور باقلانی کا خیال ہے کہ ظنی ہے اور یہ بھی اختلاف ہے کہ فضیلت ظاہر اور باطن دونوں میں حاصل ہے یا صرف ظاہر میں؟ اس میں بھی دو رائے ہیں ایک رائے نہ ہو سکی۔

قاضی عضد نے شرح مواقف میں ان تمام فضائل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو شیعہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فضیلت پر پیش کرتے ہیں اور پھر عضد نے ان فضائل کو اجر وثواب کی کثرت پر محمول کیا ہے۔

تنبیہ: ان تمام مختلف اقوال کے بعد جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ افضلیت کا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے اور یقین کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کون افضل ہے اور کون نہیں ہے؟ اور اگر افضلیت کا مطلب ثواب واجر کی کثرت بھی ٹھیرالی جائے تو عقل اس کی معرفت وادراک سے عاجز ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس بارے میں نقل پر ہی اعتماد کر سکیں گے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ مسئلہ عمل سے تعلق نہیں رکھتا کہ ظن و گمان پر اس کی عمارت قائم کر دی جائے بلکہ یہ عقائد کا باب ہے اور عقائد میں جزم و یقین کی بنیادوں پر کوئی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے دوسری جانب جو نصوص طرفین اپنے مدعا پر پیش کر رہے ہیں اول تو وہ ایک دوسرے کے معارض ہیں اور اس کے علاوہ ان کو قطعی بھی نہیں کہا جا سکتا ان نصوص سے آپ صرف اتنا ثابت کر سکتے ہیں کہ ثواب واجر کے اسباب کثرت کے ساتھ پائیں گے لیکن یہ بھی کوئی زیادہ اہم اور قوی چیز نہیں ہے کیونکہ اجر وثواب خدا کی رحمت اور فضل کی بنا پر ہے اسباب کی کمی اور زیادتی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور وہ مالک الملک پورا پورا اس کا اختیار رکھتا ہے کہ مطیع کو محروم کرے اور عاصی کا دامن اجر وثواب کی دولتوں سے مالا مال کر دے۔ اس قسم کی بحثیں سابق میں گزر چکی ہیں۔ رہا امامت کا ثبوت تو اگرچہ وہ قطعی ہے لیکن اس سے کسی کے افضل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ امامت کے منصب کی وجہ سے امام کے افضل ہونے کا ظن غالب ہو سکتا ہے کوئی قطعی بات امامت سے حاصل نہیں کی جا سکتی ہے کیونکہ اہل سنت

واجماعت کا فیصلہ ہے کہ فاضل کے ہوتے ہوئے غیر فاضل امامت کر سکتا ہے اور جن لوگوں نے فاضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت کو ناجائز ٹھیرایا ہے علماء نے ان کے فیصلہ سے کافی اختلاف کیا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ فاضل امام نہ ہوسکے اور غیر فاضل امامت کے منصب پر پہنچ جائے مگر ہم نے اپنے مشائخ کا فیصلہ یہی پایا ہے کہ ابو بکرؓ سب سے افضل ہیں ان کے بعد عمرؓ پھر عثمانؓ اور ان کے بعد علی ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ مشائخ نے جو فیصلہ کیا ہوگا اس کیلئے ان کے پاس کوئی دلیل ضرور ہوگی اس لئے ہم ان مسائل میں مشائخ کا اتباع کرتے ہیں اور حقیقت کا علم خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

ایک اور تحقیق: آمدی جو فقہ اور کلام کے زبردست عالم ہیں وہ کہتے ہیں کہ فضیلت کا مطلب یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی وصف اس طرح مخصوص ہو جائے کہ دوسرے میں وہ صفت اور خوبی موجود نہ ہو اب کبھی تو ایسا ہوگا کہ اصلی فضیلت وصفت صرف ایک ہی میں ہوگی دوسرے میں اس صفت کا نام ونشان تک نہ پایا جائے گا۔ مثلاً ہم کہیں کہ زید عالم ہے اور بکر جاہل ہے ظاہر ہے کہ بکر میں علم کی صفت قطعاً موجود نہیں ہے تو دیکھئے یہاں پر علم کی صفت زید کے ساتھ پائی گئی اور بکر اس وصف سے عاری رہا اور دوسری صورت یہ ہے کہ اصل صفت میں تو دونوں برابر ہوں لیکن پھر یہ وصف کسی میں زیادہ اور کسی میں کم ہو، مثلاً کہا جائے کہ زید بڑا عالم ہے اور بکر عالم ہے۔ اب دیکھئے وصف علم دونوں میں مشترک ہے لیکن زید میں یہ وصف زیادہ ہے اور بکر میں نسبتاً کم ہے۔ آمدی نے یہ بات سمجھا کر لکھا ہے کہ اس مذکورہ تحقیق کی بناء پر کسی صحابی کے افضل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو وصف بھی آپ کسی صحابی میں ثابت کریں گے اس وصف میں دوسرا صحابی ضرور شریک ہوگا اور اگر اس وصف میں دونوں شریک نہ ہوں گے تو پھر اتنا تو ضرور ہوگا کہ دوسرے صحابی میں کوئی ایسی خصوصیت موجود ہوگی جس کی بنا پر اس کا مقام اور منصب اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہونے کا فیصلہ آپ کریں گے۔

نیز فضائل اور خوبیوں کی کثرت سے کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے کیونکہ بسا

اوقات ایک فضیلت اپنے دائرہ کے اعتبار سے سینکڑوں امتیاز سے آگے بڑھ جاتی ہے۔
دیکھئے ایک موتی، ایک لاکھ درہم سے فائق ہوتا ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ایک فضیلت والے
کو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اجر وثواب ملے جو سینکڑوں ارباب فضائل کو نہ مل سکے۔ آمدی
نے اس کے بعد لکھا ہے کہ ان تمام حقائق کے پیش نظر اب اگر آپ فضیلت کا مطلب،
ثواب اور اجر کی کثرت بھی لیں تاہم کسی فضیلت کا یقینی فیصلہ اس سے بھی نہیں کیا جاسکتا
ہے۔ مولانا سعد الدین تفتازانی نے بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے اور محقق دوانی نے
بھی شرح عقائد عضدیہ میں ایسا ہی لکھا ہے اور شیخ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں
(صواعق محرقہ اہل تشیع کے رد میں ان کی تالیف ہے لیکن لب ولہجہ بڑا متشددانہ اور انداز
کلام بہت بے باکانہ ہے) کہ ابوالحسن اشعری نے صاف طور پر لکھا ہے کہ حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے افضل ہیں اور قاضی ابوبکر باقلانی
کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت تمام اصحاب النبی پر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ امام
الحرمین نے بھی ارشاد میں یہی لکھا ہے اور صاحب مفہم نے تو صحیح مسلم کی شرح میں اس
فضیلت کے ظنی ہونے کا بڑے جزم ویقین کے ساتھ دعویٰ کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اپنی
تصنیف استیعاب میں عبدالرزاق سے نقل کیا ہے کہ معمر کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص حضرت
عمر کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھے تو ہم اس سے کوئی اختلاف نہ کریں گے اور اگر علی
کرم اللہ وجہہ کو ابوبکرؓ وعمرؓ سے افضل کہے تو بھی ہم کو اس سے کوئی اختلاف نہ ہوگا اور اگر
شیخین کے فضل وکمال کا وہ قائل ہے ان کی خدمات کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور ان کی وہ
مدح ومنقبت کرتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ پھر کیا کہنا!

عبدالرزاق نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ معمر کی یہ رائے وکیع سے نقل کی تو
انہوں نے بھی اس کو بہت پسند کیا اور دیر تک اس کی تحسین کرتے رہے۔ ابن حجر مکی کہتے
ہیں کہ معمر کا اختلاف نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ابوبکر کی فضیلت ظنی ہے اگر قطعی
ہوتی تو ضرور اختلاف کرتے اور ہرگز اجازت نہ دیتے کہ کسی بھی شخص کو ابوبکرؓ پر فضیلت
دی جائے۔ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیش آئے کہ ابوبکرؓ کی

فضیلت کو ظنی سمجھنا جب تو ٹھیک ہو سکتا ہے کہ اجماع سے قطع نظر کر لی جائے اور ان شاذ روایات پر جو فضیلت کے ظنی ہونے کے سلسلہ میں مفید ہیں اعتبار کیا جائے لیکن اگر کوئی شخص اجماع پر یقین رکھتا ہے درآنحالیکہ اجماع قطعی دلائل میں سے ہے تو پھر فضیلت کے ظنی ہونے کا فیصلہ کیسے صحیح ہوگا؟ ابن حجرؒ نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے خود ہی لکھا ہے کہ علم اصول وفقہ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ بے شک اجماع دلائل قطعیہ میں سے ہے لیکن اجماع کی تمام اقسام قطعی نہیں ہیں بلکہ وہ اقسام قطعی ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف نہ کیا گیا ہو اور جن اقسام میں اختلاف کیا گیا ہے اگر چہ وہ اختلاف اپنی جگہ پر زیادہ موثر اور فوزنہ ہوتا ہم وہ اجماع کی قطعیت پر اثر انداز ضرور ہوگا اور پھر یہاں تو یہ بات خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس مسئلہ میں تو اجماع ہی ظنی فضیلت پر ہے قطعی فضیلت پر نہیں ہے جیسا کہ علماء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلیل قطعی اس پر موجود ہے کہ خلافت کی ترتیب یوں تھی تو علماء نے اس سے سمجھا کہ فضیلت کی ترتیب بھی اسی طرح ہوگی مگر خلافت کی ترتیب سے افضیلت کا یقین کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوتا دیکھئے عثمانؓ کی خلافت کے استحقاق پر اجماع ہے لیکن حضرت علیؓ سے ان کے افضل ہونے میں اختلاف ہو گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ خلافت کی ترتیب قطعی ہو سکتی ہے لیکن اس سے فضیلت کے قطعی ہونے کا فیصلہ کرنا قرین دانش نہ ہوگا اور اسی طرح فضیلت کا ظنی ہونا، خلافت کے ظنی ہونے کی دلیل قاطع نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ فضل واجر تو درحقیقت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا اور اس پر وحی وخبر کے علاوہ مطلع ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے پھر ان تمام کے بارے میں آنحضور ﷺ کے پراز منقبت ارشادات موجود ہیں اور وہ ایک دوسرے کے معارض ہیں اب جن خوش بختوں نے آپ کا مسعود ومبارک دور پایا تو وہ قرائن سے سمجھ گئے ہوں گے کہ کون حقیقت میں افضل ہے اور کون نہیں ہے لیکن متاخرین تو صرف آپ کے ارشادات کو سامنے رکھیں گے اور کلام کے مفہوم ہی سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور ظاہر ہے کہ آپ کے ارشادات اس سلسلہ میں معارض ہیں اس لئے ان

سے کوئی نکھری ہوئی حقیقت کو دریافت کرنا دشوار ہوگا لہٰذا ان گونا گوں اشکالات کی وجہ سے سوائے اس کے اور کوئی راہ نہیں کہ آپ پہلے لوگوں کی تقلید کریں اور ان کے ساتھ گہرا حسن ظن قائم رکھیں اور جو احادیث و اخبار اصحاب کے فضائل کے سلسلہ میں ہم تک پہنچی ہیں ان پر توقف کریں اور کوئی بات اپنی ظرف سے کہنے کی جرات نہ کریں۔ یہاں تک ہم نے صواعق محرقہ کی عبارت کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا ہے۔

ایک لطیف الزام: ابن حجر مکیؒ نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اہل سنت والجماعت تو فضیلت کے ظنی ہونے ہی کے قائل ہیں لیکن اہل تشیع کو تو چاہئے کہ وہ فضیلت کے قطعی ہونے کے قائل ہوں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے افضل ہونے کا دو ٹوک فیصلہ کریں کیونکہ شیعہ حضرت علی اور اپنے بارہ اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں اور معصوم کی دی ہوئی خبر مفید یقین ہے ان کے نقطہ نگاہ کے مطابق ناممکن ہے کہ معصوم کذب بیانی سے کام لے اور اس کے ساتھ یہ مشہور ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے دور میں علانیہ طور پر بلکہ شیعوں کی موجودگی میں ابوبکرؓ و عمرؓ کے فضائل ذکر کئے اور ان دونوں کو خود پر فضیلت دی ہے۔ حضرت علیؓ کی یہ تقریر ذہبیؒ نے ۸۲ رجال سے نقل کی ہے۔ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ ایک روز حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ آنحضور ﷺ کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں اور ان کے بعد عمرؓ اور پھر ایک اور صاحب اس پر حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنیفہ نے عرض کیا کہ اور پھر آپ؟ تو اس پر حضرت علیؓ فرمانے لگے کہ بھائی میں تو عام مسلمانوں میں سے ایک ہوں اور یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت علیؓ نے فرمایا لوگو! میں سن رہا ہوں کہ تم مجھ کو ابوبکرؓ اور عمرؓ پر فضیلت دیتے ہو۔ یاد رکھو! جو مجھ کو ان پر فضیلت دے گا وہ افتراء کرتا ہے اور میں اس کے ساتھ وہی معاملہ کروں گا جو افتراء کرنے والے کے ساتھ کیا جانا چاہئے اور امام مالک جعفر صادقؒ سے اور جعفر امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت علیؓ جا رہے تھے تو دیکھا کہ عمرؓ چادر میں لپٹے ہوئے پڑے ہیں علیؓ یہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مجھ کو بس یہی تمنا ہے کہ عمر فاروقؓ کا نامہ اعمال میرے ہاتھ میں ہو اور اللہ تعالیٰ سے میں اس طرح ملاقات کروں

کہ فاروقؓ کے کارنامے میرے اعمال سمجھ کر ان کا اجر وثواب مجھ کو دیا جائے۔

دار قطنی نے لکھا ہے کہ ابو جحیفہ، حضرت علی کو تمام امت سے افضل سمجھتے تھے لیکن ان کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی تو وہ سب کے سب اس عقیدہ کے خلاف نظر آئے ابو جحیفہ نے اپنی رائے اور عقیدہ کی یہ مخالفت پائی تو ان کو قلبی کوفت ہوئی اور وہ حضرت علی کی خدمت میں پہنچے حضرت علیؓ نے ابو جحیفہ سے دریافت کیا کہ ابو جحیفہ آج رنجیدہ کیوں نظر آ رہے ہو؟ اس پر ابو جحیفہ نے اپنی کدورت کی وجہ بیان کردی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ابو جحیفہ ہم تم کو بتائیں کہ امت میں سب سے افضل کون ہے؟ سنو ابوبکرؓ ہیں اور ان کے بعد عمر یہ سن کر ابو جحیفہ بولے کہ خدا کی قسم جو بات آپ سے سنی ہے اب کسی سے نہ چھپاؤں گا۔ یہی ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار حضرت علی کی زبان سے برسرِ منبر بھی سنے ہیں۔

بہرحال علی کرم اللہ وجہہ کے ایسے ارشادات بہت مشہور ہیں بلکہ تواتر کی حد تک پہنچتے ہیں لیکن اہل تشیع کہتے ہیں کہ ایسی ساری باتیں جو علی اور اہل بیت سے منقول ہیں تقیہ کی وجہ سے ہیں ان کے یہ حقیقی خیالات نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کی تاویل بڑی بے بنیاد اور کمزور ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ لوگ حضرت علیؓ ایسے شجاع انسان پر زبردستی بزدل کی چھاپ لگا رہے ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ حالانکہ علی کی سیرت حق پسندی اور حق پروری کے واشگاف اعلانات کی ہمیشہ سے شاہد رہی ہے۔

ایک بڑی شہادت: حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت اور بسالت پر ایک جلیل القدر انسان کی یہ شہادت قابل ملاحظہ ہے یعنی کسی دریافت کرنے والے نے جب الشافعی الامام سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوق حضرت علیؓ سے نفرت کرتی رہی اور لوگوں کا جم غفیر ان کی خلافت کو تسلیم نہ کرتا تھا؟ امام نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی حق کے اظہار میں بڑے جری تھے اور معاملات میں کسی لحاظ و مروت سے دب کر حق کے خلاف نہ کرتے تھے اور یہ خصوصیات علیؓ میں سمٹ کر کیوں جمع ہوگئی تھیں اس کی وجہ بھی امام شافعیؒ سے سنئے فرماتے ہیں کہ علیؓ زہد وغنا کے پیکر تھے اور ایسا شخص کسی کی

بھی پرواہ نہیں کرتا۔ عالم تھے اور عالم کی خصوصیت یہ ہے کہ مداہنت اس کو چھو کر بھی نہیں نکلتی وہ بہادر تھے اور بہادر کسی سے نہیں ڈرتا۔ علیؓ شریف تھے اور شرافت یہی ہے کہ امور و معاملات میں کسی کی پروانہ کی جائے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ تقیہ کی ضرورت پیش آئے تو اغیار کے ہجوم اور بے اقتداری کے دور میں پیش آئے علی کرم اللہ وجہ تو اپنے ان خیالات کا اظہار خلوت میں بھی اپنے خاص دوستوں کے سامنے کرتے تھے پھر یہ کیسے تقیہ ہوگا خلافت کے دور میں جبکہ ہر قسم کا اقتدار ان کو حاصل تھا منبر پر بیٹھ کر بھی شیخین کے متعلق انہوں نے ایسے ہی وقیع کلمات ارشاد فرمائے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس کو تقیہ کہا جائے تو کس طرح اور تقیہ پر محمول کیا جائے تو کیونکر؟

تقیہ اور امام باقرؒ: امام محمد باقر سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا خیال ہے؟ امام نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے بڑی محبت کرتا ہوں کہا گیا کہ آپ کے ان خیالات کے متعلق لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ڈر کر اس قسم کی باتیں شیخین کے متعلق کہہ دیتے ہیں حالانکہ آپ کے یہ واقعی خیالات و جذبات نہیں ہیں۔ اس پر امام باقر نے فرمایا کہ خوف ہوتا ہے برسر اقتدار زندوں سے بیچارے ابوبکر اور عمر تو کب کے وفات کر گئے اب ان سے خوف کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور کون سی آفت ہے کہ اپنے حقیقی خیالات کو چھپایا جائے اور تقیہ کرتے ہوئے جھوٹی سچی باتیں کہی جائیں۔ اس کے بعد امام باقر دیر تک امیر وقت اور سلطان عہد ہشام بن عبدالملک بن مروان کی مذمت کرتے [illegible]۔ اور خوب خوب اس کی مداہنت کوتاہیوں پر لوگوں کو توجہ دلائی۔ پھر انہیں لوگوں [illegible] دریافت کیا کہ کچھ سمجھے اگر ہم کو واقعی جذبات چھپانے کی ضرورت پیش آتی اور ہم تقیہ کرتے تو ہشام کے بارے میں ضرور اس حربہ کو استعمال کرتے کیونکہ وہ امیر ہے اور طاقت و اقتدار سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے لیکن جب ہشام کی قہرمانی ہماری زبانوں پر قفل نہ لگا سکی تو غریب ابوبکر اور عمر

سے کیا خوف اوران کی کیسی دہشت ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب امام باقر کا یہ حال ہے جو حضرت علی کی نسل سے ہیں تو پھر انہیں کی جرات پر حضرت علی کی حق گوئی وحق پژوہی کو قیاس کر و وہ علی جو شجاعت کے پیکر انصاف پسندی کے نشان اور حق گوئی کا منار تھے کیا ان کو بھی تقیہ کی ضرورت پیش آئے گی؟

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے ہی بزدل تھے تو وہ امیر معاویہؓ سے ڈرتے بنو مروان کی طاقت سے گھبراتے، وہ خانوادہ بنو مروان جو کہ جاہلیت کے زمانہ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا کر عرب سے اپنا لوہا منوا چکا تھا علی باغیوں سے لرزتے خوارج سے تھراتے لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ خوف و دہشت کے ان تمام واقع میں جہاں بڑے بڑے بہادروں کے زہرے آب ہوتے ہیں علی پہاڑ کی طرح جم کر کھڑے ہو گئے اور صرف اس وجہ سے کھڑے ہو گئے کہ دین کا نظم ونسق بدستور رہے اور حق کو باطل سے شکست کھا کر پشت نہ پھیرنا پڑے۔ علی کرم اللہ وجہ نے جب دیکھ لیا کہ اب دین کے قلعہ پر براہ راست چاند ماری شروع ہو گی۔ ایسے نازک وقت میں بھی اگر میں چپ رہا تو دین کا یہ قلعہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا اور ملت کی یہ گاڑی چلتی چلتی رک جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ کھڑے ہو گئے اور ان کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے جو خود کو علی کا سب سے بڑا حامی کہتے تھے۔ یہی عبداللہ بن سبا حضرت علی کو خدا تک کہتا تھا اگر علی رضی اللہ عنہ کو عوام الناس کی مرجعیت درکار ہوتی تو اس سے بہتر اور کون سا موقع آتا ہر قسم کے اعزاز و اقتدار ابن سبا کی تحریک سے ان کو حاصل ہو سکتا تھا لیکن حضرت علیؓ نے معاذ اللہ ابن سبا کی پوری تحریک کے مقابلہ میں ایک سیکنڈ کیلئے بھی مداہنت کو جائز نہ سمجھا اور وہ پوری قوت کے ساتھ اس خطرناک فتنہ کو کچلنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تو ان تمام واقعات و حقائق کے باوجود حضرت علی پر تقیہ کے مکروہ الزام کی جرات کون کر سکتا ہے؟

بہرحال حضرت علیؓ کے شیخین کے فضائل کے سلسلہ میں اس قدر اقوال موجود ہیں کہ اگر اہل سنت والجماعت کے علماء انہیں سے شیخین کی افضلیت کے قطعی ہونے کا فیصلہ

کریں تو بے تکلف ایسا کر سکتے ہیں۔ عبدالرزاق نے بڑے پتہ کی بات لکھی ہے کہ ہم تو شیخین کو علیؓ سے افضل اسی لئے سمجھتے ہیں کہ خود حضرت علی اپنے سے زیادہ افضل شیخین کو گردانتے تھے یہ تو کوئی بھی بات نہ ہوئی کہ علیؓ سے محبت کے دعوے بھی ہوں اور پھر ان کے فیصلوں سے صاف اعراض بھی ہو اس لئے شیعہ حضرات کو تو حضرات شیخین کی فضیلت کا اہل سنت والجماعت سے بھی زیادہ قائل اور معترف ہونا چاہئے۔

یہاں تک ہم نے صواعق محرقہ کا ترجمہ پیش کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابن حجر مکی نے اس موقع پر جو تفصیل کی ہے وہ دوسری تالیفات میں نہیں مل سکتی۔

☆☆☆☆☆☆

حواشی

۱ امام دارالہجرت کے لقب سے مشہور ہیں۔ ولادت ۹۳ھ اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ فقہ مالکی کے بانی ہیں، تورع اور تقویٰ، پاک باطنی اور پاکیزگی کے بھی امام تھے۔ آپ کے شیوخ کی تعداد ۹۰۰ تھی رجال میں چھان بین کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ امام مالک کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شبہ پڑ جاتا تو اس حدیث ہی کو ترک کر دیتے۔ ترمذی نے ایک حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے: "ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دور دور کا سفر کریں گے لیکن عالم مدینہ سے بڑھ کر ان کو کوئی عالم میسر نہ آئے گا۔" سفیان بن عیینہ کے نزدیک اس حدیث کے مصداق امام مالک تھے رحمۃ اللہ علیہ۔

۲ ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن المعروف بابن صلاح تفسیر و حدیث، فقہ و رجال کے زبردست عالم تھے ابن خلکان نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے۔ بدھ کے روز صبح کے وقت ۲۵ ربیع الآخر ۶۴۳ھ میں انتقال ہوا۔ ۵۷۷ھ میں شرخان (زور کے علاقہ) میں پیدا ہوئے تھے۔

۳ محی الدین ابوزکریا النووی محرم کے عشرہ اول میں ۶۳۱ھ میں قریہ نوی جو کہ شام میں ہے پیدا ہوئے۔ شافعی ہیں اور مسلم کی فاضلانہ شرح لکھی ہے۔ زہد و اتقاء کے پیکر تھے یہاں تک کہ دمشق کے پھلوں کے متعلق ان کو شبہ ہو گیا تو ان کو بھی کھانا چھوڑ دیا۔ (۱۴ رجب ۶۷۶ھ) بدھ کے روز وفات ہوئی۔

۴ عبدالوہاب تاج الدین السبکی مصر میں ۷۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اس کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے بھی بکی بہت جلد منطق کلام اصول جدل میں امام کہلانے لگے۔

بڑے عبادت گزار اور عابد وزاہد تھے۔ قاہرہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی اہم اور نہایت عالی تصانیف ہیں۔

۵ ابوسلیمان احمد بن محمد خطابی فقیہ محدث اور ادیب وقت تھے۔ شرح بخاری اور ابوداؤد کی شرح لکھی ہے۔ یست جو کہ است اور غزنین کے درمیان ایک شہر ہے وہیں پر ۳۸۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۶ ابو الحسن علی بن علی الامدی آمدی ہمزہ ممدودہ و میم مکسورہ آمد کی جانب نسبت ہے جو دیار بکر میں ایک مشہور شہر ہے۔ ۵۵۱ھ میں پیدا ہوئے علم کلام اور اصول فقہ کے عالم تھے، کتاب ابکار الافکار کلام میں ان کی مشہور تالیف ہے۔ دمشق میں مدرسہ عزیزیہ میں زمانہ دراز تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر شاہی عتاب کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے۔ اسی حالت میں ۶۳۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ تفتازانی، مشہور منطقی، فلسفی، جامع العلوم شخصیت ۷۲۲ھ کو تفتازانی جو خراسان کے مضافات میں ایک شہر ہے پیدا ہوئے، اہم تصانیف ان کے قلم سے نکلیں، مختصر المعانی وغیرہ آج تک درس نظامی میں اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہیں۔

صحابہؓ

عشرہ مبشرہ: امت میں سب سے زیادہ افضل "عشرہ مبشرہ" ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کو آنحضورﷺ نے جنتی ہونے کی خوشخبری دی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، ابو عبیدہ بن جراح رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

یہ دس حضرات اکابر مہاجرین اور آنحضورﷺ کے قریبی دوست ہیں۔ ان کی اسلام کیلئے بڑی زبردست خدمات ہیں اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے انہوں نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں جن سے دوسروں کی تاریخ خالی ہے۔ اسی طرح ان کا بہشتی ہونا بھی قطعی ہے لیکن امت میں صرف یہی جنتی نہیں ہیں بلکہ آپؐ نے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی بہشت کی خوشخبری سنائی ہے۔ مثلاً فاطمہ، حسن، حسین، خدیجہ، عائشہ، حمزہ، عباس، سلمان، صہیب، عمار بن یاسر، رضوان اللہ علیہم اجمعین

لیکن ان دس حضرات کی شہرت ہے اور باقی لوگوں کی شہرت نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دس حضرات کو ایک ہی وقت میں اور ایک ہی حدیث میں آنحضورﷺ نے بشارت دی ہے اور باقی لوگوں کو بھی بطریق اور گاہے گاہے اور عقائد کی کتابوں میں عشرہ مبشرہ کا ذکر اہتمام کے ساتھ اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات اسلام کے ستون اور اسلام کی تاریخ کے ہیرو ہیں۔ نیز بعض گمراہ فرقے ان کے ساتھ شایانِ شان معاملہ نہیں کرتے اس کی تردید کیلئے بھی تذکرہ کیا جاتا ہے مگر اس سے یہ سمجھنا کہ صرف یہی بہشتی ہیں قطعاً غلط ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک دلچسپ ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض پڑھے لکھے آدمی بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں وہ کہتے ہیں کہ عشرہ مبشرہ کو بشارت قطعی طور پر دی گئی لیکن

باقی اصحاب کی بشارت ظنی ہے جو قوت و استحکام میں عشرہ مبشرہ کی بشارت تک نہیں پہنچتی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنے والوں کی نظر احادیث کے ذخیرہ پر بلکل نہیں ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں لوگوں کی متضاد اور خلاف واقعہ باتیں سن کر ایک رسالہ ''تحقیق الاشارۃ فی تعیم البشارۃ'' کے نام سے لکھا ہے احادیث سے ان حضرات کے نام تلاش کر کے اس رسالہ میں جمع کر دیے گئے جن کو آپ ؐ نے بہشت کی بشارت دی ہے۔ ہماری تحقیق اس سلسلہ میں یہ ہے کہ چاروں خلفاء اور فاطمہ حسن، حسین اور ایسے دوسرے حضرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بشارت قطعی ہے اور حد تواتر تک پہنچتی ہے اور عشرہ مبشرہ میں باقی حضرات کی بشارت بھی شہرت کی حد تک ہے اور کچھ ایسے ہیں کہ ان کے بہشتی ہونے کی خوشخبری خبر واحد ہی تک ہے۔ بہر حال اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ احادیث میں کثرت سے ایسے خوش نصیب لوگوں کا ذکر ملتا ہے جن کو آپ ؐ نے یہ بشارت دی۔ ہاں پھر اطلاع اور خبر کے مراتب ضرور بدل گئے اور اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ مسلمان تمام بہشت میں جائیں گے اور کافر یقیناً جہنمی ہیں۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل آپ کو ہمارے اسی رسالہ میں ملے گی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

مجاہدین بدر: عشرہ مبشرہ کے بعد اسلام میں پھر سب سے افضل مجاہدین اور شہدائے بدر ہیں۔ بدر کی لڑائی جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ۲ھ میں پیش آئی اور یہی وہ سب سے پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ پورا ہوا۔ اسلام کا غلبہ ہوا اور کفار کی طاقت ٹوٹ گئی۔ مشرکین کے بڑے بڑے سرغنے عتبہ، شیبہ، ابوجہل وغیرہ اسی غزوہ میں جہنم رسید ہوئے اور پانچ ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد کی گئی۔ عشرہ مبشرہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ بدرین میں سے ہیں۔ حضرت عثمانؓ اس وقت حضرۃ رقیہؓ صاحبزادی رسول اللہ ﷺ کی علالت کی وجہ سے مدینہ میں مقیم تھے لیکن آپ ﷺ نے عثمان کو بھی بدرین میں شمار کیا اور مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ متعین کیا

تھا۔ بدر کی لڑائی میں شریک ہونے والوں کی تعداد تین سو تیرہ ہے یہ سب کے سب بہشتی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ "اعملوا ما شئتم" "کرتے جاؤ جو چاہو۔"
اور حدیث میں ہے کہ جس شخص نے بدر اور حدیبیہ میں شرکت کی ہو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں کبھی داخل نہ کرے گا اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ جن ملائکہ نے بدر میں شرکت کی ہے ان کو بارگاہِ کبریائی میں وہ اعزاز و اکرام حاصل ہے جو دوسرے فرشتوں کو حاصل نہیں ہے۔

احد اور اس کے مجاہد: اہل بدر کے بعد پھر فضیلت احد میں شریک ہونے والوں کیلئے ہے۔ یہ غزوہ ۳ھ میں پیش آیا اور مسلمانوں کو اس میں کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی وہ غزوہ ہے جس میں آپ ؐ کا دندانِ مبارک بھی شہید ہوا۔ اگرچہ آپ ؐ کا پورا دندان شریف تو شہید نہ ہوا مگر پھر بھی اس کا کچھ حصہ شہید ہو گیا تھا۔ حضرت حمزہؓ اور ان کے علاوہ ستر صحابی اس معرکہ میں شہید ہوئے۔ عشرہ مبشرہ اس معرکہ میں بھی شریک تھے۔ غزوہ احد میں مشرکین کا کمانڈر ابوسفیان اموی تھا۔ بدر کے بعد اس نے قسم کھائی تھی تاوقتیکہ آپ ؐ سے اور مسلمانوں سے بدر کا انتقام نہ لے لوں گا بیوی سے قربت اور بدن پر تیل تک استعمال نہ کروں گا۔ ابوسفیان اور معاویہ کا اسلام فتح مکہ کے بعد ہے۔

بیعت رضوان: احد کے بعد وہ لوگ افضل ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی۔ بیعت رضوان وہ بیعت ہے جو کہ مسلمانوں نے صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ سے کی۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ.

اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے تجھ سے اس درخت کے نیچے۔

اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جہنم میں نہ جائیں گے جنہوں نے درخت کے نیچے مجھ سے بیعت کی ہے۔ قرآن کی اس آیت اور حدیث کی وجہ سے بیعت رضوان والوں کو بھی قطعاً بہشتی سمجھنا چاہئے۔ افضلیت کے سلسلہ میں اب تک جو ترتیب ہم نے

پیش کی ہے امت کا اس پر اجماع ہے جیسا کہ ابو منصور تمیمی نے نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اپنی اپنی خدمات کے مطابق فضیلت کے مستحق ہیں لیکن علماء نے اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں کی ہے اور پھر اصحاب النبی کے بعد فضیلت اہل علم اور تقویٰ کو ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم.

''مقررعزت اللہ کے ہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا''۔

اس کے ساتھ بعض بزرگوار آباء واجداد کی اولاد کو بھی فضیلت حاصل ہے۔ ان میں حضرۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد سب پر فائق ہے۔

بہشت کی شہزادی: ایک حدیث میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بہشت کی تمام عورتوں کی سردار ہیں اور حسن وحسین رضی اللہ عنہما نوجوانانِ فردوس کے سردار ہیں۔ اس حدیث کے متعلق ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی ایک اور تالیف میں بحث کی ہے اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بہشت کی بشارت قطعیت کے ساتھ صرف عشرہ مبشرہ ہی کو حاصل ہے۔ علماء نے روافض کی تردید کیلئے عشرہ مبشرہ کا تو ذکر اہتمام سے کیا ہے لیکن اگر وہ ناصبہ کے خیالات کی تردید کیلئے ان تین کا بھی ذکر کرتے تو بہت مناسب تھا۔

اس حدیث سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ان تمام عورتوں پر ظاہر ہے جو مومنات ہیں اور بہشت میں جائیں گی تا آنکہ اس حدیث کے پیش نظر امام سیوطیؒ نے حضرت فاطمہؓ کو حضرت مریم بنت عمران، عائشہؓ اور خدیجہؓ سے بھی افضل ٹھیرایا ہے۔ احادیث کے ذخیرے میں بعض احادیث تو ایسی ملتی ہیں جن میں حضرت فاطمہؓ ہی کو تمام عورتوں پر فضیلت ہے لیکن مریم بنت عمران کا استثناء کر لیا گیا یعنی حضرت فاطمہؓ حضرت مریم سے افضل نہیں ہیں۔ ایسی احادیث جن میں حضرت مریم کا استثناء کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت مریم دونوں ہم پایہ وہم رتبہ

ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور حدیث ہے اس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام عورتوں میں سب سے افضل فاطمہؓ، خدیجہؓ، عائشہؓ، مریم اور آسیہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ہم مرتبہ ہیں یا پھر آپؐ نے کسی ایک کو افضل قرار دینے سے احتراز فرمایا ہے۔ ایک دوسری حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کہ: ''فاطمہ اس امت میں اسی مقام و منصب کی مستحق ہیں جو مقام مریم کو اپنے عہد میں حاصل تھا''۔ بہت ممکن ہے آنحضور ﷺ کو مختلف اوقات میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مقام اور رتبہ سے مطلع کیا جاتا رہا ہو۔ اسی لئے آپ کے مختلف ارشادات ہمارے سامنے آئے اور آخر میں فاطمہؓ کو تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی گئی۔ بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے افضل ہیں۔ اس لئے کہ بہشت میں حضرت عائشہؓ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہوں گی اور حضرت فاطمہؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہمراہ اور ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ کا مقام بہشت میں علی کرم اللہ وجہہ سے بمراحل آگے ہوگا۔ لیکن علماء نے حضرت عائشہؓ کی افضلیت پر جو دلیل پیش کی ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ''میں، تم، علی اور حسن و حسین ایک ہی مقام میں ہوں گے۔ ہاں بعض علماء نے حضرت عائشہؓ کی افضلیت پر بھی دلیل دی ہے کہ وہ مجتہد تھیں اور خلفاء اربعہؓ کے دور میں بھی اجتہاد کرتی تھیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عائشہ، خدیجہ سے افضل ہیں۔ امام سیوطیؒ نے اپنے فتاوے میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کی تین رائے ہیں۔ صحیح ترین مذہب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے حضرت فاطمہؓ ہی افضل ہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں ہم مرتب ہیں اور تیسری جماعت ان دونوں کو افضلیت کے مسئلہ میں جزم و یقین کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ بلکہ سکوت کو مناسب سمجھتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ احناف بڑی کثرت کے ساتھ اور بعض شوافع سکوت و خاموشی ہی کو مناسب کہتے ہیں۔

لیکن امام مالکؒ سے جب دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ فاطمہؓ جگر گوشہء رسول ہیں میں ان پر کسی کو بھی فضیلت نہ دوں گا اور سبکیؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے خیال میں

سب سے افضل فاطمہؓ ہیں۔ پھر ان کی والدہ خدیجہؓ اور اس کے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں لیکن امام سیوطیؒ نے اس تمام اختلاف کو ختم کرنے کیلئے ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں میں تو سب سے افضل فاطمہ اور مریم ہیں اور امہات المومنین میں افضلیت کا مقام خدیجہؓ اور عائشہؓ کو حاصل ہے۔ خصائص خضری میں یہ بھی ہے کہ خدیجہؓ اور عائشہؓ کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ متقدمین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ حضرت خدیجہؓ افضل ہیں۔ بعض احادیث میں ہے کہ تمام عورتوں میں سب سے زیادہ کامل مریم بنت عمران، فاطمہؓ بنت محمد ﷺ اور آسیہ فرعون کی بیوی ہیں۔ بعض روایات میں آسیہ کے بجائے فرعون کی بیوی بنت فراحم کا لفظ موجود ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فاطمۃ زہریؓ، حضرت عائشہؓ سے افضل ہیں اور وہ حدیث جس میں ہے کہ عائشہؓ کو عورتوں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسا کہ ثرید (یعنی سالن میں تر کی ہوئی روٹی) کو باقی کھانوں پر، اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں عائشہؓ کی فضیلت ان چار عورتوں کے علاوہ سب پر ہے۔ ابن حجرؒ نے اس طرح مختلف احادیث میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اگرچہ فضیلت اور افضلیت کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں۔ تاہم احادیث کے ذخیرے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد میں آپ کو سب سے زیادہ تعلق فاطمہؓ سے تھا اور حضرت خدیجہؓ کے بعد ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ سے آپ کو بہت محبت تھی۔

دراصل احادیث اس سلسلہ کی بہت مختلف ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ عورتوں میں سب سے محبوب آپ کو عائشہؓ تھیں اور مردوں میں آپ کا قلبی تعلق ابوبکر صدیقؓ سے تھا اور دوسری حدیث میں ہے کہ عورتوں میں فاطمہؓ اور مردوں میں علیؓ آپ ﷺ کے محبوب تھے۔ پھر بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنے والد سے بھی افضل ہیں۔ اس لئے اس اختلاف سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت اس کے علاوہ نہیں ہے کہ آپ فضیلت اور افضلیت کے اسباب متعدد تسلیم کریں پھر کسی کو کسی وجہ سے فضیلت حاصل ہوگی اور

دوسرے کو دوسری وجہ سے افضلیت کا مقام میسر ہوگا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ فضیلت اگر کثرت اجر کے معنی میں آپ لے رہے ہیں تو اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے اور جہاں تک شرف نسب اور جوہر ذاتی کا تعلق ہے تو حضرت فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور دوسرے اہل بیت کے علاوہ کوئی بھی افضل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امارت نہ کہ خلافت: حدیث میں ہے کہ میرے بعد تیس سال تک خلافت رہے گی اور پھر ایک ایسی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے گی جس کی مشقت و تکلیف سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ آنحضور ﷺ کے بیان کے مطابق یہ مدت، حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ کی خلافت پر پوری ہوگئی ہے یہ تو عام طور پر علماء کی رائے ہے لیکن اس سلسلہ میں تحقیق و کاوش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تیس سال کی مدت پورا ہونے میں ابھی چھ ماہ باقی تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ شہید ہو گئے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے اور اس طرح تیس سال کی مدت خلافت کے عدل آگیں عہد پر ختم ہوئی۔ لہٰذا امیر معاویہؓ اور ان کے بعد جو کوئی بھی ہے سب امراء بادشاہ اور سلطان ہیں۔ ان کو خلیفہ نہیں کہا جا سکتا اور امرائے عباسیہ کو جو تاریخ میں خلفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ شیخ کمال الدین ابن ہمام نے مسائرہ میں لکھا ہے کہ تمام اہل حق اس پر متفق ہیں کہ معاویہ امیر تھے خلیفہ نہ تھے لیکن اہل سنت والجماعت کے بعض مشائخ اس میں اختلاف کرتے ہیں کہ آیا معاویہؓ حضرت علی کی شہادت کے بعد امیر ہی سمجھے گئے ان کو اسلامی تاریخ میں خلیفہ کی حیثیت کبھی بھی نہ مل سکی، لیکن بعض یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ خلیفہ ہو گئے تھے ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی جس کے بعد امیر معاویہؓ کے خلیفہ ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

بہرحال یہ بحث تفصیل طلب ہے اور جہاں تک ہم جانتے ہیں علماء کی بڑی جماعت نے امیر معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار ہی کیا ہے۔

صحابہ اور ان کا ذکر خیر: اہل سنت والجماعت کی رائے یہ ہے کہ حضرات صحابہ

رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کسی بھی قسم کا اعتراض وانکار کرنا اوران کو برا بھلا کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ جب بھی ان کا ذکر کیا جائے تو اچھائی کے ساتھ تذکار ہو تو خوبی کے ساتھ صحابہ کی یہ عظمت اس لئے ضروری ہے کہ وہ سرورکونین روحی فداہ کے ہم نشین اور رفیق ہیں اس لئے ان کی رفاقت اور ہم نشینی کا ہرحال میں لحاظ رکھنا چاہئے۔قرآن کریم میں صحابہ کے متعلق ہے کہ:

محمد رسول اللہ والذین معه (القرآن کریم)

محمد رسول اللہ اور جوان کے ساتھ ہیں۔

رضی اللہ عنهم ورضوا عنه (القرآن الحکیم)

اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔

اس کے ساتھ احادیث میں ان کے بے شمار فضائل ومناقب ہیں مثلا ایک حدیث میں ہے کہ: ''میرے صحابہ ہدایت کے نجوم وکواکب ہیں جس کی بھی اقتداء کرو گے تو ہدایت پاؤ گے''۔ دوسری حدیث میں ہے کہ: ''میرے اصحاب کی عزت واحترام کرو کیونکہ وہ تم میں سب سے بہتر ہیں''۔ایک اور حدیث ہے کہ: ''میرے صحابہ کے بارے میں خدا سے ڈرو، میرے بعد ان کو اپنی زبان درازی کا شکار مت کر لینا، جوان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے، جس نے ان کو ستایا مجھ کو ستایا اور جس نے مجھ کو اذیت دی وہ براہ راست اللہ کو تکلیف دے رہا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو تکلیف دے تو یقیناً اللہ اس کو چھوڑے گا نہیں''۔ان بے شمار مناقب وفضائل اور احادیث کے ہوتے ہوئے جس کے قلب میں نور ایمان کی ہلکی سی تابانی بھی موجود ہے صحابہ کو برا کہنے کی جرات نہیں کر سکتا اور جو کچھ صحابہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض اہل بیت کے حقوق کی رعایت نہ کر سکے یا ان میں باہمی طور پر کچھ رنجشیں رہا کیں تو ان کو اول تو صحیح تسلیم کرنے ہی میں تامل ہے اور اگر بالفرض تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان تلخ واقعات سے چشم پوشی کرنا چاہئے۔کیونکہ یہ تمام واقعات اور ان کی

شہرت غیر یقینی ہے اور ان کی صحابیت ایک یقینی امر ہے لہٰذا اس کو غیر یقینی شہرتوں سے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے اخیار اور اکابر صحابہ تو درکنار معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور ایسے دوسرے صحابی جن کے حق میں لغو گو زاویوں کے کچھ کذب بیانوں کے طومار ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے حق میں بھی اہل سنت والجماعت نے ہمیشہ اپنی زبان بند رکھی ہے۔ مورخین نے صحابہؓ کے باہمی جھگڑوں کے سلسلہ میں جو رنگ آمیزی کی ہے اس کو پڑھ کر اگر خدانخواستہ دل میں کوئی وحشت اور تکدر ہو تو بھی زبان کو اپنے قابو ہی میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ صفین کی لڑائی میں، ایک قیدی حضرت علیؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس قیدی کے حال زار پر ایک صاحب کو رحم آیا تو بولے کہ خدا کی قدرت ہے کہ یہ کیسا روشن احوال مسلمان تھا اور آج امیر المومنین کی مخالفت کے نتیجہ میں اپنی عاقبت کیسی خراب کر لی۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، یہ آج بھی مسلمان ہی ہیں۔ تو جب حضرت علیؓ اپنے مخالفوں کے حق میں بھی یہ رائے رکھتے تھے تو ہم کو کوئی غلط بات کہنے کی جرأت کرنا کس حد تک مناسب ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر صحابہ میں سے کسی پر ایسا الزام تراشا گیا ہو جس کے بارے میں دلیل قطعی سے برات ہو چکی تھی تو یہ کفر ہوگا۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر زنا کا الزام، حالانکہ ان کی برات پر خود قرآن شاہد ہے اور اگر کوئی ایسی طعن دھرا گیا جس کے بارے میں کوئی دلیل قطعی موجود نہیں ہے تو پھر الزام تراشنے والا بدعتی ہوگا۔

امیر معاویہؓ: امیر معاویہؓ کے سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کی رائے ہے کہ انہوں نے اور ان کے حامیوں نے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں بغاوت کی ہے۔ کیونکہ علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ برحق تھے اور ان کی خلافت کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوئی بھی وجہ جواز موجود نہ تھی۔ علی رضی اللہ عنہ کی مظلومیت اور مخالفین کی بغاوت کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اس حدیث کا مضمون ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''علی تم کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی تم ان کو بہشت کی جانب بلاؤ گے اور وہ تم کو جہنم کی جانب

کھینچیں گئے" لیکن اس کے باوجود امیر معاویہ اور ان کے حامیوں کو کسی نے نہ کافر کہا اور نہ ان پر لعنت کرنا درست قرار دیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مومن کو کسی پر لعنت کرنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ "مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ دوسروں پر لعنت کرے" اور تو اور اسلام نے تو کافر پر بھی لعنت کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہے کہ کسی کا انجام کیا ہونے والا ہے، بہت ممکن ہے کہ آج جو کفر و شرک کی نحوستوں میں مبتلا ہے آنے والی کل میں یہی ایمان کی روشنی سے اپنے قلب و باطن کو منور پائے۔ ہاں آپ لعنت ضرور کر سکتے ہیں مگر صرف اسی شخص پر جس کے متعلق آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ یہ کافر ہی رہے گا اور اس کی موت بھی کفر پر ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ کسی شخص کے متعلق ایسا یقینی فیصلہ کون کر سکتا ہے؟ بعض علماء نے تو یزید کے حق میں بھی کسی لعنت کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگرچہ بعض ظاہر بین سمجھتے ہیں کہ یزید تمام مسلمانوں کے اتفاق سے خلیفہ ہو چکا تھا، لہٰذا اس کی اطاعت حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر واجب تھی۔ افسوس کہ یزید کی حمایت میں یہ کس درجہ غلو اقدام ہے اور واقعہ کے کس قدر حضرت حسین پر الزام ہے اس تخیل کے قائم کرنے والے علماء سے دریافت کیا جائے کہ یزید مسلمانوں کے اجماع سے امیر ہی کب منتخب ہوا تھا کہ حضرت حسینؓ نے اجماع کے خلاف کیا اور ان سے یہ جرم سرزد ہوا۔ یزید کے دور میں صحابہ بھی تھے اور صحابہ کی اولاد بھی لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ تمام صحابہؓ اس کی اطاعت کو قطعاً واجب نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ایک جماعت مدینہ منورہ سے زبردستی ضرور یزید کے پاس شام لے جائی گئی تھی اور یزید نے ان کی شاندار پذیرائی بھی کی لیکن جب یہ لوگ اس کے فسق و فجور پر آگاہ ہوئے تو اسی وقت یہ واپس چلے آئے اور علی الاعلان یزید کی بیعت خلافت کو انہوں نے توڑ دیا اور عام لوگوں کے سامنے یہ بھی انہوں نے کہا کہ یزید اللہ کا دشمن، شرابی، تارک صلوٰۃ، زانی، فاسق اور حرام کو حلال کرنے والا ہے۔ پھر بتایا جائے کہ مدینہ کے ان اکابر نے یزید کے جو حالات بیان کئے کیا ان حالات واحوال کے بعد یزید خلافت کا استحقاق رکھتا ہے؟

یزید سے بعض حسن ظن رکھنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ یزید نے حضرت حسینؓ کو

شہید کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ وہ اور اس کے عزیز و اقارب حسینؓ کی شہادت پر خوش ہوئے لیکن یزید کو اس ناپاک جرم سے بری رکھنے کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکے گی کیونکہ یزید کو اہل بیت سے جو بغض و فساد تھا اور اس نے جس طرح ان کو ذلیل کیا اور جیسا وہ ان کی شہادت کے بعد مسرور و خوش ہوا اس کی داستان مشہور ہے بلکہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق معنوی تواتر تک پہنچتی ہے۔ ایسے مشہور واقعات کا انکار دھاندلی ہے، یزید پرستوں کا ایک گروہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یزید صرف گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ اس نے حضرت حسین کو شہید کیا اور ناحق کسی مسلمان کو قتل کرنا گناہ کبیر ہے۔ اس لئے یزید پر لعنت نہ کی جائے گی کیونکہ لعنت صرف کافر ہی پر ہونا چاہئے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب پر لعنت درست نہیں ہے۔ کاش کہ ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آنحضور ﷺ نے اہل بیت اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کو کسی قسم کی تکلیف دینے والے کے حق میں کیا کہا ہے۔ قرآن مجید میں صاف طور پر موجود ہے کہ:

ان الذین یوذون اللّٰہ و رسولہ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا و الاٰخرۃ واعدلھم عذاباً مھیناً۔

جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو ان کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور رکھی ہے اور ان کے واسطے ذلت کی مار۔

پھر سوچنا چاہئے کہ کیا حسین کے ناحق قتل اور اہل بیت کی کھلی توہین سے آنحضور ﷺ کو قلبی اذیت نہ پہنچی ہوگی؟ اور کیا آنحضور ﷺ کو اذیت دینے والا کسی رعایت و مراعات کا مستحق ہے؟ کچھ یہ بھی کہتے ہیں ممکن ہے کہ یزید نے موت سے پہلے اپنے اس جرم عظیم سے توبہ کر لی ہو اور ہم کو اس کی توبہ کے بارے میں اطلاع نہ پہنچ سکی ہو۔

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے بھی یہی لکھا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض جلیل القدر ائمہ نے یزید پر لعنت کی ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ بھی اس پر لعنت کو صحیح سمجھتے

ہیں۔ ابن جوزیؒ جو متقلب عامل سنت ہیں انہوں نے بھی یزید پر لعنت کے جواز کے سلسلہ میں بعض اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض علماء نے لعنت کرنے سے منع بھی کیا ہے اور بعض نے توقف کیا ہے۔ بہر حال اتنا تو سب ہی کہتے ہیں کہ وہ مبغوض ترین انسان ہے اس بدبخت کی تاریخ بڑی سیاہ ہے جس کی سیاہی یزید پرستوں کی کوشش کے باوجود سفیدی سے نہ بدل سکی۔ یہی شخص ہے جس نے حضرت حسینؓ کو قتل اور اہل بیت کی کھلی اہانت کے بعد اپنا لشکر مدینہ روانہ کیا اور لشکر کو حکم دیا کہ مدینہ کو اجاڑ دو، برباد کر دو، صحابہ اور تابعین کو قتل کرنے کا امر کیا، مدینہ کے بعد مکہ معظمہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ ابن زبیر کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور انہیں سفاکیوں اور درندگیوں میں جہنم رسید ہوا۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ توبہ کب کی اور کس نے سنی، ہم تو دعا کرتے ہیں کہ اللہ کرے کسی بھی مومن کے قلب میں اس ظالم کی اور اس کے اعوان و انصار کی ذرا بھی محبت اور تعلق پیدا نہ ہو اور اللہ کرے کہ اس کی براءت کیلئے کسی مومن کی زبان اور قلم آلودہ نہ ہو اور اللہ کرے کہ میرا اور میرے دوستوں کا حشر اہل بیت کے ساتھ ہو اور اس مقدس طائفہ کے ساتھ ہو جو اپنے قلب میں آل نبی کی محبت رکھتے ہیں اور جن کا باطن نبی کی اولاد کے تعلق سے لبریز ہے۔ **وھو قریب مجیب امین.**

خطا و ثواب: صحیح مذہب یہ ہے کہ مجتہد سے اجتہاد میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور عموماً اس کا اجتہاد درست بھی ہوتا ہے لیکن وہ اپنی غلطی کیلئے معذور ہے یا کہ اس کو اس غلطی پر ثواب و اجر بھی ملے گا کیونکہ اس نے اپنی تمام کاوشیں صرف کیں اور خود اس کی جانب سے جدوجہد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی اور رہا ثواب و اجر، سو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر تم نے غلطی کی تو ایک ثواب اور اگر اجتہاد میں درستی پر قائم رہے تو دگنا اجر ملے گا اور بعض کہتے ہیں کہ مجتہد سے غلطی ہوتی ہی نہیں ہے اور اجتہاد میں درستگی صرف یہی ہے کہ اس نے تمام کوششیں کسی فیصلہ تک پہنچنے کیلئے صرف کر دیں۔ علماء کا یہ اختلاف کہ مجتہد سے غلطی کا سرزد ہونا ممکن سمجھتے ہیں اور بعض اس کا انکار کرتے ہیں فروعات، اعتقاد، عملیات، احکام فقہی میں ہے کیونکہ

ان ابواب میں غلبہ ظن کی بناء پر فیصلے چل نکلتے ہیں یہاں یقین و جزم کی ضرورت نہیں ہے۔ اعتقادیات اور مسائل کلامیہ میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اعتقادیات، ایک حقیقت ہیں اور حقیقت ایک ہوتی ہے اس کے متعدد ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اجتہاد کی شرائط اور مجتہد کی تقلید بعض خاص صورتوں میں کسی مجتہد کی تقلید کو ترک کرنا یہ عنوانات تفصیل طلب ہیں اور اس موضوع کی تالیفات سے ان کی تفصیل طلب کرنی چاہئے۔

اہل قبلہ اور ان کی تکفیر: اہل قبلہ یعنی وہ لوگ جو مسلمانوں کے قبلہ کی جانب نماز پڑھتے ہیں اور کتاب وسنت سے تمسک کرتے ہیں۔ شہادتین کا تلفظ کرتے ہیں ایسے لوگوں کو باوجود یہ کہ ان کی بعض باتوں سے کفر بھی مترشح ہوتا ہو کافر نہیں کہنا چاہئے۔ بشرطیکہ وہ ان کفریہ کلمات پر مداوت نہ کریں اور یہ کفریہ کلمات ان سے کلی طور پر ظاہر نہ ہوں۔ پس جب تک اصلاح کا امکان ہے کسی کو کافر کہنے سے پورا پورا احتراز کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص دوسرے کو کافر کہتا ہے اور وہ کافر نہ ہو تو کہنے والا اسی وقت کافر ہو جاتا ہے۔ لعنت کے متعلق بھی حدیث میں اسی قسم کی وعید ملتی ہے اس لئے لعنت اور تکفیر دونوں میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔

متفرق مسائل

رسول فرشتہ سے افضل ہے: طبقہ انسان کے مخصوص افراد یعنی انبیاء اور رسول خاص اور مقرب ملائکہ سے افضل ہیں اور اولیاء و متقی، عام فرشتوں سے افضل قرار دے گئے ہیں اور مقرب فرشتے تو وہ عام انسانوں سے بہرحال افضل کہے جائیں گے۔ یہ تحقیق بالکل اجماعی ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ مقرب فرشتوں کے مقابلہ میں انبیاء اور رسول کی فضیلت کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں اور سجدہ ایک ایسی خدمت ہے جس سے عبودیت اور تذلل کا کامل طور پر اظہار ہوتا ہے اور ادنیٰ ہی اعلیٰ کو کرتا ہے پس جب آدم کی فضیلت اس طرح ثابت ہوگی تو کیونکہ تمام انبیاء ہم رتبہ اور مساوی المرتبہ ہیں تو اس طرح تمام انبیاء اور رسل کی فضیلت خاص خاص فرشتوں کے مقابلہ میں بھی ثابت ہو جائے گی۔ مگر یہاں اتنی بات ضرور ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ یہ دلیل جس سے انبیاء کی فضیلت ملائکہ پر ثابت کی جارہی ہے اس کی حیثیت معتزلہ کے مقابل میں الزامی دلیل سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ معتزلہ فرشتوں کو انبیاء سے بھی افضل سمجھتے ہیں۔ اس دلیل سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کی تہہ تک رسائی کیلئے انسانی جدوجہد کا نمونہ ہی غلط ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں حکمتوں کا احاطہ کون کرسکتا ہے، وہ تو کبھی اپنی قدرت کے مظاہرہ کیلئے ایک اعلیٰ کو ادنیٰ کے سامنے سجدہ کا حکم دے سکتا ہے۔ "یفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید" اور آپ کو معلوم ہوگا کہ اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق تو اللہ تعالیٰ پر حکمت کی رعایت کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔

فضیلت پر ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ کمالات کی تحصیل، مواقع کی موجودگی

میں ایک کمال ہے اور انسان کا یہی حال ہے کہ نفس کی آلودگیوں کے باوجود وہ روحانیت میں ترقی کرتا ہے اور اس کا روحانی عروج فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ رہے ملائکہ تو ان کا کیا کمال کیونکہ وہ بشریت کی آلودگیوں سے پاک ہیں ان کا باطن خیر ہی کی طرف ان کو لے جاتا ہے۔ کوئی ایسی طاقت جو سرکشی و نافرمانی کی طرف ان کو کھینچے ان میں موجود نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر یہاں بھی افضلیت سے مراد اجر و ثواب کی کثرت ہے تو پھر انسان کے افضل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر جسمانی علائق اور کدورتوں سے نزاہت مطلوب ہے تو پھر فرشتوں کے افضل ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ان گوناگوں اشکالات کی وجہ سے اہل تحقیق مختلف حیثیات کا اعتبار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مجاہدات کی زندگی انسان کی زندگی ہے اس طرح تو وہ افضل ہے اور کدورتوں سے فرشتے پاک ہیں اس حیثیت سے ان کو افضل سمجھنا چاہئے اور انسانی ترقی یہ ہے کہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر فرشتوں کے مقام سے بھی آگے بڑھ جائے اور عالم ملکوت سے اس کے روابط قائم ہوں لیکن اس کے ساتھ اگر یہ بھی ملحوظ ہو کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے، اللہ کے اسماء اور صفات کا مظہر ہے، تو پھر انسان کے افضل ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض علماء نے کہا کہ دلائل متعارض ہیں اور یہ مسئلہ کوئی یقینی ہے بھی نہیں۔ اس لئے سکوت ہی مناسب ہے۔ مگر اتنا تو اعتقاد رکھنا چاہئے کہ آنحضور ﷺ جن اور ملائکہ تمام انسانوں اور کل مخلوقات سے افضل ہیں۔ ہاں ہم پہلے بتا چکے کہ انبیاء کو افضل اہل سنت والجماعت کہتے ہیں ورنہ معتزلہ اور کچھ اشاعرہ فرشتوں ہی کو افضل سمجھتے ہیں اور امام اعظمؒ اس مسئلہ میں توقف کرتے ہیں۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدا میں وہ ملائکہ کے افضل ہونے کے قائل تھے اور آخر میں اس عقیدہ سے رجوع کرتے ہوئے انسان کے افضل ہونے کے قائل ہو گئے تھے۔ قاضی ابوبکر باقلانی بھی توقف کو مناسب کرتے ہیں لیکن تحقیقی بات یہی ہے کہ اس مسئلہ میں موشگافیوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ اعتقادات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ تاج الدین سبکی نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں عمر بھر بھی یہ سوال نہ ابھرا ہو کہ کون افضل ہے اور کون نہیں، تو امید یہی ہے کہ اس سے

قیامت میں اس کے بارے میں کوئی سوال بھی نہ ہوگا اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ فضیلت کی بحث جہاں بھی چھڑے گی تو پھر وہاں سکتؔ ہی کی بات کارآمد ہوگی زیادہ سے زیادہ مختلف جہات کا اعتبار کرتے ہوئے خاموشی سے نکل جایئے۔

کرامات: اسلام میں ولی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو معرفت خدا کے مراحل طے کر چکا ہو، اطاعات پر مداومت رکھتا ہو، گناہوں سے احتراز اس کا امتیاز ہو اور جائز شہوات و لذات سے بھی کنارہ کشی اس کا شعار ہو، اگر ان متقات کے وسائل سے کوئی خرق عادت صادر ہو تو ممکن ہے اس کا انکار نہیں کرنا چاہئے اور یہ کرامت حقیقتاً نبی کا معجزہ ہی ہے کیونکہ ولی اسی نبی کی امت میں ہے۔ مثلاً آنحضور ﷺ کے متعدد اقسام کے معجزات ہیں ان میں بعض آپؐ سے بعثت سے پہلے صادر ہوئے جن کو اصطلاحی زبان میں ارہاص کہا جاتا ہے اور بعض زندگی میں بعثت کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور آپ کی وفات کے بعد آپؐ کے متبعین سے بعض معجزات صادر ہوئے جن کو کرامت کہتے ہیں۔ یہ کرامت آنحضور ﷺ کی صداقت اور آپؐ کے دین کی صحت پر ایک مضبوط دلیل ہے۔ اس لئے ہم ان کو آپؐ کے معجزات کہہ سکتے ہیں۔ بعض صحابہ اور اولیاء امت سے کرامتوں کا ثبوت تواتر تک پہنچتا ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق امام عبداللہ یافعی کا ارشاد ہے کہ شیخ جیلانی رحمہ اللہ کی کرامات کی شہرت تواتر تک ہے اور کسی بھی ولی و بزرگ کے متعلق ایسی شہرت نہیں ہے۔

بعض علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ولی سے نبی جیسا معجزہ صادر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کسی ولی سے شق قمر، سلام حجر سجدۂ شجر کی کرامت صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ولی سے ارادتاً کرامت صادر نہیں ہوتی۔ ہاں اتنا ضروری ہے کہ جس شخص سے کرامت صادر ہو رہی ہے وہ ولایت کا مدعی ہو لیکن ٹھیک یہ ہے کہ معجزہ کی جنس سے ولی کے ہاتھ پر کرامت صادر ہوسکتی ہے اور بلا ارادہ بھی اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ شیخ عبدالقادر کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ دعوے کے ساتھ کرامت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ البتہ ولی کیلئے کرامت کا مظاہرہ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی کرامت تو دین

پر استقامت ہے۔ عمر گزر جاتی ہے اور ولی سے کسی کرامت کا صدور نہیں ہوتا ہاں کرامت کے اظہار میں بھی کوئی جرج نہیں ہے کیونکہ کسی مرید کو اپنا معتقد بنانے کیلئے جبکہ اس عقیدت میں دینی فائدہ ہو اگر شیخ کرامت دکھا دے تو مناسب ہے اور اگر نہ دکھائے تو بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

علماء نے خرق عادت کی چار صورتیں کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایمان اور عمل صالح نہیں ہے اور پھر خرق عادت کا کسی سے ظہور ہو رہا ہے تو اس کو مکر اور استدراج کہا جائے گا اور اگر ایمان بھی ہے اور معرفت بھی تقویٰ بھی اور عمل صالح بھی، تو ایسے شخص کی خرق عادت، کرامت کہلائے گی اور اگر نبوت کے دعوے کے ساتھ ہے تو معجزہ ہے اور اگر عام مسلمان سے کوئی ایسی بات سرزد ہو گی تو اس کو معونت کہتے ہیں اور جادو، منتر، شعبدے طلسمات تو ان کو خرق عادت نہیں کہہ سکتے کیونکہ خرق عادت میں اسباب کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور ان تمام چیزوں میں اسباب کو کلی طور پر دخل ہے جو شخص بھی ان اسباب کو اختیار کر لے تو اس سے یہ شعبدے وغیرہ سرزد ہو سکتے ہیں جیسا کہ طبیب حاذق کے علاج سے شفاء حاصل ہو جاتی ہے اس لئے ان چیزوں کو خرق کہنا ٹھیک نہ ہو گا۔

ولایت و نبوت: ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی ولی نبی نہیں ہو سکتا کیونکہ انبیاء میں علاوہ ان تمام کمالات کے جو اولیاء میں موجود ہوتے ہیں عصمت بھی ہوتی ہے نبوت کے منصب سے معزول ہونے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا وحی بھی ان کے پاس آتی ہے۔ عالم ملکوت کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ احکام کی تبلیغ اور عام انسانوں کی ہدایت فریضہ بھی ان کے سپرد ہوتا ہے۔ ان تمام امتیازات کا تقاضا ہے کہ نبی کو ولی سے بہر حال افضل سمجھنا چاہئے اور جو اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے علماء کی تصریح کے مطابق وہ کافر ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولی کو نبی سے افضل کہا جا رہا ہے بلکہ ولایت کو نبوت سے افضل قرار دینے کی کوشش ہے کیونکہ ولایت کا مطلب ہے کتاب قدس سے قربت اور نزدیکی اور بارگاہ بے نیاز سے استفادہ و استفاضہ اور نبوت کا تعلق مخلوق سے ہے اور مخلوق ہی میں اپنے کمالات کا افادہ

ہے۔ اس اعتبار سے ولایت، نبوت سے افضل ہوسکتی ہے اور نبی میں کیونکہ یہ دونوں نسبتیں ہوتی ہیں اس لئے وہ ولی سے افضل ہوگا مگر اس کے باوجود یہ تحقیق موہم ہے اس لئے اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے اور اس پیرایہء بیان کو اختیار کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔

احکام شرعیہ ساقط نہیں ہو سکتے: بعض بیدین اور جاہل صوفیا میں مشہور ہے کہ جب صوفی مقامِ محبت کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے قلب صاف ہوتا ہے اور ایمان اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو ایسے وقت میں صوفی سے احکام شرعیہ ساقط ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب پر بھی نہ اس سے مواخذہ کرے گا اور نہ وہ جہنم میں جائے گا۔ استغفر اللہ. یہ عقیدہ کفر اور ضلالت ہے۔ انسان جب تک عاقل ہے شرعی احکام کا وہ مخاطب ہے۔ کسی بھی وقت اس سے احکام شرعیہ ساقط نہیں ہو سکتے۔ ان جاہل صوفیاء سے کوئی دریافت کرے کہ ان مقامات پر پہنچنے کے بعد تو طاعات وعبادات میں اور زیادہ اہتمام ہونا چاہئے نہ کہ وہ ساقط ہو جائیں اور عذاب دینا نہ دینا تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے۔ چاہے وہ دے یا نہ دے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء سے زیادہ ایمان کن کا راسخ ہوگا۔ مقام محبت میں ان مقامات تک کن کی رسائی ہے۔ جہاں تک یہ طائفہ رسائی رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود کسی نبی سے احکام شرعیہ ساقط نہ ہوئے اس اعتراض سے بچنے کیلئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انبیاء احکام شرعیہ کی تشریح کیلئے آئے ہیں اس لئے ان سے تکلیف ساقط نہ ہونی چاہئے اور صوفیاء سوان کا یہ منصب نہیں اس لئے ان سے احکام کا سقوط ہوسکتا ہے، افسوس کہ یہ لوگ تشریع کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ تشریع کا مطلب یہ ہے کہ خود بھی عمل کریں اور دوسروں سے بھی عمل کرائیں۔ تو اب احکام شرعیہ پر عمل کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا۔ تشریع نام ہے ایجاب کا اور سقوط تو وہ ایجاب کے قطعاً منافی ہے۔ بہر حال یہ عقیدہ غلط ہے اور اس قسم کے خیالات سے احتراز کرنا چاہئے۔

تاویل: آیات اور احادیث کو کوشش کرنا چاہئے کہ وہ اپنے ظاہر ہی پر رہیں۔

بلاضرورت تاویل نہ کرنا چاہئے۔ اس بحث کی تفصیل، تاویل کے جواز اور ناجائز ہونے کی تحقیق اور اس کی شرائط امام غزالی کی تالیف ''التفرقہ بین الکفر و الزندقہ'' میں بسط سے لکھی گئی ہیں اسی مفید تصنیف کی جانب مراجعت کرنا چاہئے۔ فرقہ باطنیہ قائل ہے کہ قرآن و حدیث کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں بلکہ کچھ رموز و اشارات ہیں جن کو معلم ہی سمجھ سکتا ہے امام معصوم کو وہ معلم کہتے ہیں لیکن ان کا یہ تخیل الحاد و زندقہ ہے ان سے دریافت کیا جائے کہ اگر قرآن و حدیث کے ظاہری معنی مراد نہیں تو یہ نماز، روزہ، زکوٰۃ حج وغیرہ عبادات کہاں سے ثابت ہوئیں؟ اور اگر قرآنی رموز و اشارات کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تو پھر قرآن کو نازل کرنے سے کیا فائدہ؟ اور یہ معلم کا جو انہوں نے شوشہ چھوڑا ہے تو کیا وہ نبیؐ سے کوئی بڑے منصب پر فائز ہے؟ حالانکہ نبیؐ نے تو ظاہر ہی پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی عمل کی تلقین کی ہے۔ کچھ نہیں ان بے دینوں کا مقصد یہ ہے دین و شریعت کی قید سے آزاد ہو کر اپنی ہوس رانیوں کی راہ نکال لیں۔ محققین کی رائے یہ ہے کہ نصوص سے قطعی طور پر تو ظاہری معنی ہی مراد ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں کچھ رموز و اشارات بھی ہیں اور ان اسرار کا ان ظواہر سے کچھ منافات بھی نہیں ہے۔ مثلاً قرآن مجید نے موسیٰ اور فرعون کے واقعات سنائے اب یہ دو شخصیتیں ہیں اور واقعات ان کے ساتھ پیش آئے اب ہوسکتا ہے کہ انہیں کی پوری داستان روح و نفس کے تعبیری الفاظ سے ادا کر دی جائے لیکن یہ کہنا تو کسی طرح بھی صحیح نہ ہوگا کہ نہ موسیٰ نامی کے کوئی پیغمبر گزرے اور نہ فرعون نام کا کوئی کفر کا امام ہوا، بلکہ جہاں کہیں موسیٰ اور فرعون کا ذکر آیا ہے وہاں روح اور نفس ہی مراد ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں وادیٔ مقدس میں از راہِ تعلیم ادب موسیٰ سے جوتہ اتارنے کیلئے کہا گیا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بارگاہِ قرب میں کونین سے بے نیازی کا ایماء تھا لیکن یہ کہنا تو ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ نہ وادیٔ مقدس تھی اور نہ جوتہ اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس قسم کی جو باتیں کرتا ہے وہ غلط ہیں اور یہ مہمل تاویل الحاد و زندقہ کی شاخ ہے جس سے احتراز کرنا چاہئے۔

مردوں کیلئے دعائے مغفرت: اگر زندہ لوگ مردوں کیلئے دعاء مغفرت

کریں اور ان کو ثواب پہنچانے کیلئے صدقہ و خیرات کریں تو اس میں مردوں کیلئے زبردست نفع ہے۔ اس سلسلہ میں احادیث و آثار بکثرت ہیں جس کے بعد اس مسئلہ میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو نماز جنازہ کا مقصد بھی آپ کو یہی نظر آئے گا۔ احادیث میں تو یہاں تک ہے کہ اگر کسی مردے کی سو آدمی نماز پڑھ لیں اور اس کیلئے دُعائے مغفرت کریں تو وہ یقیناً مغفور ہوگا۔ حضرت سعد بن عبادہ کی والدہ کا جب انتقال ہوگیا تو انہوں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ایصالِ ثواب کیلئے بہترین صدقہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ "پیاسوں کو پانی پلانا"۔ اس پر سعد نے کنواں کھدوایا اور اس کا نام "چاہ ام سعد" رکھا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ دعا سے بلیات ٹل جاتی ہیں اور صدقہ خدا کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عالم، قبرستان سے گزر جائے تو چالیس روز کیلئے اس قبرستان سے خدا کا عذاب اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس حدیث سے علم، تعلیم، اور تعلم کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حفاظ ایصال ثواب کیلئے قبر پر متعین کئے جا سکتے ہیں۔

(شاہ صاحبؒ نے جو تحریر فرمایا ہے احناف کے یہاں عام طور پر اس پر عمل جائز نہیں بلکہ علماء احناف تصریح کرتے ہیں کہ اجرت پر تلاوت کلام مجید جائز نہیں ہے اور ایسی تلاوت کا ثواب قبر والے کو نہ پہنچے گا تفصیل کیلئے شامی، تاج الشریعہ کی شرح ہدایہ وغیرہ ملاحظہ ہو۔)

کارساز: اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اور ان کی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ اگر صدق دل، تضرع اور زاری سے دعا کی جائے تو یقیناً دنیا میں یا پھر آخرت میں قبول ہوگی۔ ہاں دُعاء کی قبولیت کیلئے کچھ شرائط ہیں، سب سے بڑی شرط حضور قلب اور اکل حلال ہے اور دعا کی قبولیت کو روک دینے والی چیز یہ ہے کہ آپ کہنے لگیں کہ خدا تو میری دعا قبول ہی نہیں کرتا۔ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہ کہنا چاہئے اور یہ بھی ہے کہ شرائط کے فقدان اور موانع کی موجودگی کے باوجود اللہ کے فضل سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔

خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ دعا عبادت ہے جس طرح دوسری عبادتیں وقت پر ہی مقبول ہوتی ہیں اسی طرح دُعا بھی نزول بلا اور شب احوال کے وقت میں خوب مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ادعونی استجب لکم مجھ سے دُعاء کرو قبول کردوں گا۔

مثنوی ۔

اے اخی دست از دعا کردن مدار   با اجابت با روایت چہ کار!!

پس دعا ہا کان زبان ست و وبال   از کرم می نہ شود شانِ ذوالجلال

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سائل کی دعا کے خلاف اس سے اچھی چیز دے دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی کاشتکار، بادشاہ کے یہاں پہنچ کر عربی گھوڑے کا سوال کرے لیکن بادشاہ اس کو بجائے عربی گھوڑے کے کھیتوں میں بہترین کام کرنے والا بیل دے دے تو بظاہر یہ صورت ایسی ہے کہ بادشاہ نے سائل کی درخواست رد کردی لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بادشاہ نے اپنی صوابدید سے اس کی بہترین مصلحت کا لحاظ کیا ہے۔ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی سمجھو جس میں بندوں کی مصلحت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے ساتھ وہ کرنا چاہتے ہیں ہاں اگر آپ فضول قسم کی دعائیں مانگنے لگیں یا نفسانی خواہشات کی دعا کرنے لگیں تو یہ آپ کا بارگاہِ قدس سے دور کردے گی اور عذاب الٰہی کے آپ مورد بن جائیں گے۔ **العیاذ باللہ.**

اور اصل بات تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن رکھتا ہے تو اس کے نزدیک قبول ہونا اور دعا کا قبول نہ ہونا سب برابر ہے۔ صوفیاء نے اسی لئے کہا ہے کہ مخلوق اگر دے بھی تو بھی یہ محرومی ہے اور اللہ تعالیٰ اگر محروم بھی رکھے تو یہ اس کا احسان ہے۔ کافر کی دعا کے متعلق نص قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ ارشاد ہے کہ

وما دعا الکافرین الا فی ضلال.

اور کچھ نہیں پکارنا کافروں کا مگر بھٹکنا۔

ہاں دنیاوی امور میں ان کی بھی دُعا قبول ہوتی ہے، لیکن کافر مظلوم ہے تو مظلوم کی دُعا ہر حال میں مستجاب ہے۔ واللہ اعلم.

اہتمام جماعت: نماز باجماعت کا اہتمام رکھئے اگرچہ آپ کو کسی فاسق وفاجر کے پیچھے نماز پڑھنی پڑے۔ کسی متقی اور نیک امام کی تلاش میں جماعت کو جو آنحضورﷺ کی سنت موکدہ ہے ترک کرنا، اسلامی خود بو کے بالکل خلاف ہے۔ آنحضورﷺ جماعت کے بارے میں جس قدر اہتمام فرماتے تھے کسی دوسری عبادت میں اس قدر اہتمام نہ تھا۔ اگر متقی امام مل جائے تو بہتر ہے ورنہ فاسق کی امامت میں بھی نماز ادا کرنا ہی اچھا ہے۔ بشرطیکہ اس کا فسق وفجور، کفر کی حدود تک نہ پہنچتا ہو۔ نماز کے مسائل چند قرآنی آیات وسورتیں ہر شخص کو یاد رکھنا ضروری ہیں۔

خفین (چمڑے کے موزوں) پر مسح: علماء نے لکھا ہے کہ اہل سنت والجماعت کی تین علامتیں ہیں۔ شیخین (حضرت ابوبکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما) کو فضیلت دینا، حسنین وعثمان وعلی رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھنا اور خفین پر مسح کے جائز ہونے کا اعتقاد رکھنا، موزے پر مسح کے متعلق فقہاء کا فیصلہ ہے کہ حضر میں ایک دن ایک رات اور سفر میں تین دن اور تین راتیں رہ سکتا ہے۔ اہل بدعت موزہ پر مسح کا انکار کرتے ہیں۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میری ملاقات ستر صحابہ سے ہوئی ان میں سے ہر ایک مسح کا قائل تھا۔ حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ اگر شریعت ودین کے مسائل اور احکام میں قیاس کو دخل ہوتا ہے تو گندگی ونجاست سے آلودہ ہونے کا امکان موزہ کے نیچے کے جانب میں ہے اور ہم اس موقع پر مسح کرنے کا فیصلہ کرتے۔ لیکن شریعت کے احکام میں عقل کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شارع کے حکم کے مطابق موزہ کے اوپر کی جانب مسح کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

ایک بات ذہن نشین رکھنی چاہئے۔ وہ یہ کہ اصل یہی ہے کہ آپ پیر ہی دھو ڈالیں اور مسح کرنا صرف رخصت واجازت ہے لیکن اس کے باوجود مسح کے جواز کا عقیدہ رکھنا چاہئے اور اگر کسی موقع پر منکرین کے ہجوم میں مسح کرلیں تو مصلحت سے بہت قریب ہوگا۔

گناہوں کو ہلکا سمجھنا: گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اس کو جائز سمجھنا یا ہلکا تصور کرنا کفر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بشریت کی وجہ سے کوئی گناہ کر گزرے لیکن پھر بھی اس کو گناہ ہی سمجھنا چاہئے اور اپنی کوتاہی کا ہر حال میں اعتراف کرنا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو ہلکا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ یہ گناہ ہی نہیں یا ان پر عذاب ہی نہ ہوگا۔ ایسا سمجھنا غلط ہے ہاں اس کا انکار بہر حال نہیں ہو سکتا کہ بڑے گناہوں کے مقابلہ میں چھوٹے گناہ ہلکے ہی ہیں۔

اسی طرح شریعت کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے اور ایسے ہی اگر کسی شخص نے کلمہ کفر کا تلفظ مذاقاً کہا یعنی نہ اس کے معنی مراد لیتا ہے اور نہ اس کا اعتقاد رکھتا ہے، لیکن یہ بھی کفر ہی ہے اور یہ وہ موقع ہے کہ یہاں جہالت بھی عذر نہیں بن سکتی۔ ہاں بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کفر ہے تو اس صورت میں اس کو معذور قرار دیا جائے گا اور یہ تو سب ہی کہتے ہیں کہ کفر کا حکم اس وقت پر ہے جبکہ ان سے قصداً اس کا تلفظ کیا ہو، ورنہ سہواً تلفظ کی صورت میں کوئی تکفیر نہیں کرتا۔

شرابی کافر نہیں: شرابی اگر نشہ کی حالت میں جبکہ اس کی عقل بالکل زائل ہو چکی ہو کفریہ کلمات نکالے تو اس سے وہ کافر نہیں ہوگا۔ اگر چہ نشہ کی حالت میں اس کے بعض تصرفات شرعاً جائز ہیں مثلاً اس کی خرید و فروخت نافذ ہوگی۔ آزاد کرے گا تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ اپنی بیوی کو طلاق دے گا تو وہ فوراً مطلقہ ہو جائے گی، لیکن یہ سب کچھ اس کی تنبیہ کیلئے ہے۔ کفر کا معاملہ بالکل دوسری نوعیت رکھتا ہے اور تو اور اگر نشہ کی حالت میں اسلام قبول کرے گا تو بھی صحیح ہوگا۔ اسلام اور کفر میں یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کفر ایک ناپسندیدہ امر ہے اس لئے نشہ کی حالت کا بھی اسلام قابل قبول سمجھنا چاہئے۔ امام شافعی اور امام اعظم کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ شراب کے نشہ میں اگر کسی نے ارتداد کیا تو اس پر مرتد ہونے کا حکم لگا دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

کاہن اور منجم: جو کاہن غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تصدیق کرنا بھی کفر

ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے کاہن کی تصدیق کی اس نے محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کو غلط سمجھا اور اس کی تکذیب کی ہے۔ عرب میں بڑی تعداد میں کاہن تھے اور شیاطین وغیرہ سے ان کو جھوٹی سچی خبریں ملتی تھیں۔ منجم بھی کاہن ہی کے حکم میں ہے۔ اس لئے جو شخص نجومی کی تصدیق کرتا ہے وہ بھی کافر ہی ہے اس کا تو انکار نہیں ہو سکتا کہ سیارات اور اجسام علوی کو سردی گرمی بارش، پھلوں کے پکانے، کھیتیوں کے تیار کرنے میں دخل ہے، لیکن سعادت وشقاوت میں بھی ان کی تاثیر ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے فرض کرو اگر ان حدود میں بھی ان کی کوئی تاثیر ہے تاہم اس کا قائل نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ شریعت میں اس سے شدت سے روکا گیا ہے۔ دوسری شریعتوں میں جائز رہا ہو تو رہا ہو اسلام میں ناجائز ہونے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس فیصلہ کو صحیح سمجھنا چاہئے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیارات اللہ تعالیٰ نے تین فائدوں کیلئے پیدا کئے ہیں۔ آسمان کی خوشنمائی اور زینت کیلئے، غیبت کی خبریں سننے والے شیطانوں کو مار بھگانے کیلئے اور شب میں مسافروں کیلئے راستہ کی علامتوں کے طور پر اب جس شخص نے ان تین فائدوں کے سوا اس میں اور فائدے تلاش کئے اس نے غلطی کی اپنا وقت ضائع کیا اور بلاوجہ ایسی کوشش کی جس کا اس کو علم نہیں۔ تعلیقات بخاری۔

اور ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نجوم میں ان فائدوں کے سوا جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے کوئی نیا فائدہ حاصل کیا تو اس نے جادو کے ایک شعبہ کا استعمال کیا، نجومی کاہن کی طرح غیب کی خبریں بتاتا ہے اور کاہن ایک قسم کا جادوگر ہوتا ہے اور جادوگر کافر ہے۔

زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ شب کو پانی برس چکا تھا، اس کو صبح کو آنحضور ﷺ نے مقام حدیبیہ میں ہم لوگوں کو نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہو چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کچھ جانتے ہو تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے۔ سب نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے کہا یہ فرمایا ہے کہ آج صبح میرے بندوں میں دو فریق ہو گئے ایک مومن ہو گیا اور ایک کافر۔ جس نے یہ کہا کہ

اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے پانی برسا ہم پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا اور جس نے یہ کہا کہ فلاں ستارہ کی وجہ سے پانی برسا وہ ہمارا منکر ہو گیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔ (بخاری شریف)

علامہ نوادیؒ نے لکھا ہے کہ اگر بارش کی نسبت ستاروں کی طرف اسی اعتقاد کے ساتھ کی ہے جب تو صریح کفر ہے اور اگر صرف ایک علامت ہونے کی بنا پر ہے جب بھی ایک موہم لفظ کے استعمال کی کیا ضرورت ہے۔ (کتاب الاذکار ص ۱۵۷)

خدا سے ناامید ہونا: اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا کفر ہے۔ مسلمان خواہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو لیکن اس کو رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ توبہ و استغفار سے خدا معاف کر دے گا اور اگر توبہ بھی نہ کرے تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے معاف کر سکتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خود کو محفوظ سمجھنا بھی کفر ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

لا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون.

سو نڈر نہیں اللہ کے داؤ سے مگر جو لوگ خراب ہوں گے۔

''مکر کے لغوی معنی چھپانے اور دھوکہ دینے کے ہیں۔ اللہ کا مکر یہ ہے کہ بندہ پر معصیت کے عالم میں نعمت کے دروازے کھول دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اس حالت سے دھوکہ میں پڑ جاتا ہے اور پھر اچانک اس کو پکڑ لیا جاتا ہے اور اس طرح پکڑا جاتا ہے کہ اس کو اس کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا''۔

خوف و رجا: خوف و رجا کی حالت میں رہنا ہی اسلام و ایمان ہے۔ رجاء کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہ سن پائیں کہ ایک شخص ہی جنت میں جائے گا تو بس امید رکھیں کہ میں ہی وہ خوش قسمت ہوں گا اور خوف اس درجہ کا ہو کہ اگر ایک ہی بدقسمت کے جہنم میں جانے کی خبر دی گئی ہے تو اپنے ہی متعلق خطرہ ہونے لگے۔

آنہا کہ خاص درگہ تکریم اند — دہشت زدگان عالم تسلیم اند

نومید مشو کہ رحمت حق عام است — مغرور مشو کہ خاصگان در بیم ان

علماء نے لکھا ہے کہ زندگی میں خوف طاری رہنا اور موت کے وقت رجا سعادت کی علامت ہے۔

اِعلموا ان اللہ شدید العقاب و ان اللہ غفور رحیم۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ رسالہ رحمت و مغفرت اور رجا کے بیان پر ختم ہو رہا ہے، کہ یہ بھی خاتمہ بالخیر کی علامت ہے۔

والحمد للہ علیٰ ذالک۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

☆☆☆

☆☆

☆